AUGUST
2022

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

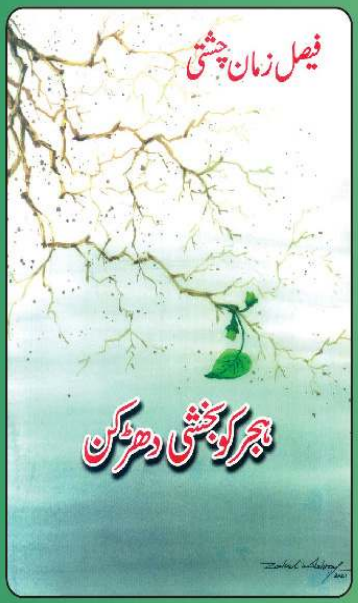
فیصل زمان چشتی
ہجر کو بخشی دھڑکن

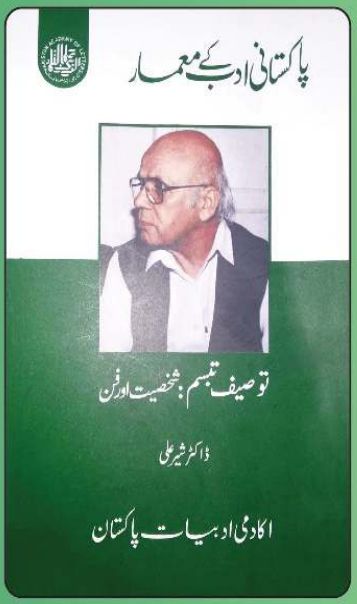
پاکستانی ادب کے معمار
توصیف تبسم: شخصیت اور فن
ڈاکٹر شیر علی
اکادمی ادبیات پاکستان

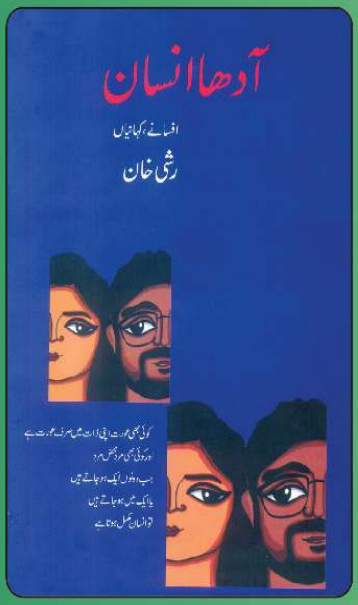
آدھا انسان
افسانے کہانیاں
رشی خان

مَنظور جھلّا
(حیاتی تے فن)
صفدر دامق

لمحہ لمحہ

دور تک قرب کا اجالا ہے
طے تحیّر کی وادیاں کر لے
ہاتھ میں کس نے ہاتھ ڈالا ہے
دور تک قرب کا اجالا ہے
کوئی پہلو سے اُٹھنے والا ہے
لمحے لمحے کو حرزِ جاں کر لے
دور تک قرب کا اُجالا ہے
طے تحیّر کی وادیاں کر لے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - اگست 2022 - شمارہ نمبر: 8

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ آزادی مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک $100 پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلیکیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر روڈ بالمقابل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	آصف ثاقب، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	نسیم سحر ، اکرم ناصر ، محمد یٰسین قمر	9 تا 11
3	سلام	سید فخر الدین بلّے ، آصف ثاقب، جلیل عالی، نسیم سحر گلزار بخاری، خالد علیم، اقبال سرویہ، شاہین مفتی، راحت سرحدی سرور حسین نقشبندی، طاہر ناصر علی، اسد اعوان	12 تا 23
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	24 تا 28
5	مضامین	آصف ثاقب، نثار ترابی، زاہد حسن، ارشد چہال ظفر معین بلّے جعفری، سمیرا کیانی، محمد علیم زبیر، عادل سعید قریشی طاہر منیر افضل، سیدہ آمنہ ریاض ، محمد احمد	29 تا 73
6	مباحثہ	ابتدائی نوٹ: فیصل زمان چشتی گفتگو: فرحت عباس شاہ ، علی نواز شاہ پروفیسر شفیق احمد خان ، تاثیر نقوی، مقصود خالق صاحبِ صدارت: پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید	74 تا 81
7	شاعرِ امروز	توقیر احمد فقیہ حیدر [شاہد ماکلی]	82 تا 85
8	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	86 تا 94
9	غزلیں	خالد احمد، سلطان سکون، آصف ثاقب، جلیل عالی، محسن اسرار، نسیم سحر حسن عسکری کاظمی، ناصر علی سید، سید ریاض حسین زیدی، رشید آفرین	95 تا 187

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	صفدر صدیق رضی، گلزار بخاری، اقبال مرزبہ، یعقوب پرواز، واحد سراج احمد جلیل، سعد اللہ شاہ، منظور ثاقب، شوکت محمود شوکت، آغا نثار، مسعود احمد جمشید چشتی، ابن عظیم فاطمی، راحت سرحدی، حسنین سحر، واصف سجاد میثم نقوی، ظہور چوہان، ذکی طارق، افتخار شاہد، اسحاق وردگ سید فرخ رضا ترمذی، شاہد ماکلی، سہیل احمد صیم، عقیل رحمانی، رضا اللہ حیدر طاہر ناصر علی، رخشندہ نوید، صائمہ آفتاب، اعجاز دانش، طلعت شبیر تصور اقبال، ہمایوں پرویز شاہد، انیس احمد، ارشد محمود ارشد، علی حسین عابدی ریاض ندیم نیازی، فیض رسول فیضان، دانش عزیز، شبیر نازش، اکرم جاذب صغیر احمد صغیر، ازور شیرازی، امر مکی، وسیم جبران، عامر عباس ناصر اعوان شفقت حیات شفق، جیا قریشی، عمر فیاض قائل، سجاد حسین ساجد، عاصم اعجاز عطاالحسن، بشیر احمد حبیب، احسن عزیز، سید ضیا حسین، صدام ساگر سرفراز عارض، تاثیر جعفری، امتیاز انجم، مقصود محسن، مزمل سارب علی رضا بلوچ، عالمگیر ہراج، محمد علی ایاز، شہاب اللہ شہاب، رخسانہ سحر احمد محسود، ثانیہ جمال ثانیہ، کوکی گل، رافعہ ارم مرزا، علی آرش روبینہ ممتاز روبی، عدنان خالد، علیم اطہر، نائلہ راٹھور، رمیض نقوی مزمل ادریس، مہر علی، حسنین آفتاب، رانا محمد شاہد، ارسلان ساحل سید صائم شیرازی، اسد رضا سحر، کاشف واصفی، نوید صادق، اعجاز رضوی	95 تا 187
10	افسانے	ابدال بیلا، نجم رضوی، اسلام عظمی، عاصم بخاری	188 تا 213
11	نظمیں	سید فخرالدین بلے، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، نسیم سحر ناصر علی سید، گلزار بخاری، تابش کمال، طالب انصاری گل بخشالوی، رخشندہ نوید، نائلہ راٹھور، دردانہ نوشین خان علی حسین عابدی، مرزا آصف رسول، علمدار حسین، سعدیہ بشیر صغیر احمد صغیر، مظفر حسن بلوچ، نجم رشید، ریحانہ شبیر، اعجاز رضوی	214 تا 236
12	خطوط	نسیم سحر، محمد انیس انصاری، طالب انصاری، اشرف کمال، رانا محمد شاہد	237 تا 241

حمد

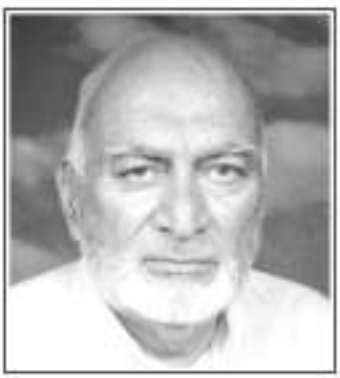

آصف ثاقب

میرے رب کا یہ کارخانہ ہے
زندگی کا جو آب و دانہ ہے

اس کی رحمت سے جینے والوں کو
پانی پینا ہے کھانا کھانا ہے

شام رنگین ہے وظیفوں سے
اُس کے یادوں سے دن سہانا ہے

ہے خدا کا کرم مرے گھر میں
سب عزیزوں کا آنا جانا ہے

خانہ کعبہ کا نور آنکھوں میں
ہر دعا سے سدا بسانا ہے

سبز گنبد کو دیکھنے کے لیے
رب نے چاہا تو مجھ کو جانا ہے

ہم سے وعدہ ہے جس محبت کا
کتنی ماؤں کا وہ خزانہ ہے

ہر دعا ہی ہے استقامت کی
میرا تنکوں کا آشیانہ ہے

رب کی دائم ہے ہر عطا ثاقبؔ
ہر عنایت بھی جاودانہ ہے

حمد

انعامِ حق تعالیٰ بہم ہے طواف میں
بندوں پہ سائبانِ کرم ہے طواف میں

بخشش کا فیصلہ ہو تو ہوتے ہیں باریاب
گویا ہجوم اہلِ ارم ہے طواف میں

اک کیف، اک خمار سا دیوار و در میں ہے
لگتا ہے جیسے سارا حرم ہے طواف میں

آرام کر رہے ہیں کئی انبیا یہاں
ہر سو جمالِ شاہِ امم ہے طواف میں

اک دائرے میں جیسے سمٹ آئی کائنات
سارا جہان لگتا ہے ضم ہے طواف میں

دامن کشا ہے سب کے لیے باب ملتزم
جو جو رہینِ رنج و الم ہے طواف میں

ہر بار ہے نگاہ میں گوشہ حطیم کا
کیا کیا کرم خدا کی قسم ہے طواف میں

خود ہو رہا ہے اپنے گناہوں کا اعتراف
شرمندگی سے آنکھ بھی نم ہے طواف میں

سرور میں خوش نصیبوں کے ہمراہ ہوں رواں
مجھ پہ بھی سائبانِ کرم ہے طواف میں

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

کہاں میری جرأت، شہِ دوسراؐ
کہ لکھ پاؤں مِدحت، شہِ دوسراؐ

کروں پیش مَیں بھی درود و سلام
اگر ہو اجازت، شہِ دوسراؐ

سبھی آپؐ کی، آپؐ کی نذر ہیں
یہ حرفِ عقیدت، شہِ دوسراؐ

شفاعت کے طالب ہیں یہ آپؐ سے
سرشکِ ندامت، شہِ دوسراؐ

ازل سے ابد تک فقط آپ ہی
مجسم محبت، شہِ دوسراؐ

سفر کے مقاصد سکھاتی ہوئی
مدینے کو ہجرت، شہِ دوسراؐ

ادب سے نہ لے کوئی نام آپؐ کا
بھلا کس کی جرأت، شہِ دوسراؐ؟

عمل آپؐ کا بھی مثالی بنا
نمونہ ہے سیرت، شہِ دوسراؐ

کمالِ کلام آپؐ کا تھا نسیمؔ
فصیحت، حلاوت، شہِ دوسراؐ

نسیمِ سحر

نعتؐ

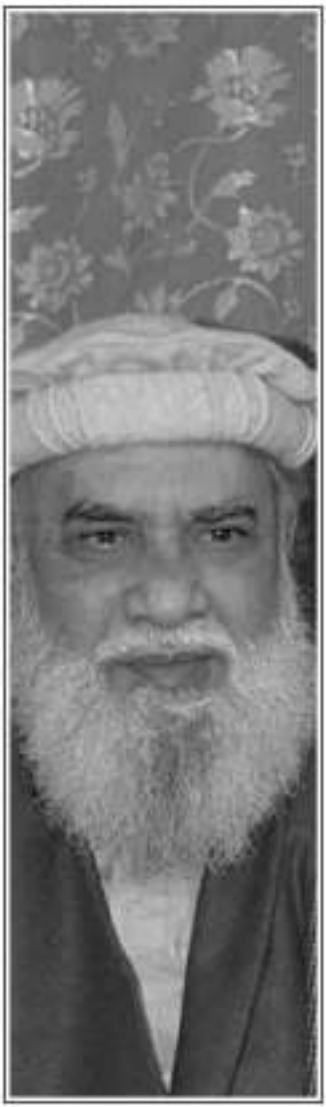

زمیں اسی کے لئے، آسماں اسی کے لئے
بنائے اس نے ہیں، دونوں جہاں اسی کے لئے

نہ اس سے پہلے کھلا ہے، نہ اس کے بعد کھلا
کھلا ہے صرف درِ لامکاں اسی کے لئے

اسی کے واسطے روشن کئے ہیں شمس و قمر
بچھائی راہ میں ہے کہکشاں اسی کے لئے

یہ فتح مکہ کے فاتح کا فیصلہ ہے سنو
جو تم سے مانگے اماں ہے اماں اسی کے لئے

اسی کے واسطے سوچوں، جو بات سوچوں میں
کھلے اگر، تو کھلے یہ زباں اسی کے لئے

وہی ہے مرکزی کردار اس کہانی کا
ازل، ابد کی ہے یہ داستاں اسی کے لئے

ہر ایک لب کا وظیفہ درودِ سیدِ پاک
ہر ایک شخص ہے رطب اللساں اسی کے لئے

اکرم ناصر

نعتؐ

اُنؐ کو سوچا تو ہوا دل کا مدینہ خوشبو
جنؐ کے آنے سے ہوا سارا زمانہ خوشبو

رات کے پچھلے پہر چٹکے ثنا کے غنچے
دل کے آنگن میں ہوئی انجمن آرا خوشبو

جاں کے آفاق پہ لکھا ہے محمدؐ، احمدؐ
ہوگئی اس لیے ہر ایک تمنا خوشبو

ہر قدم راہ سجھاتی تھی مرے جذبوں کو
راہِ طیبہ میں بنی میرا وسیلہ خوشبو

سوچتا رہتا ہوں محبوبؐ خدا کی ہستی
میرے ہمراہ ہے ہر آن اُجالا خوشبو

جن کے کردار میں بس جائے نبیؐ کی سیرت
دونوں عالم میں بنے اُن کا حوالا خوشبو

چھڑ گئی بات مدینے کے گلی کوچوں کی
ہوگیا دامنِ احساس سراپا خوشبو

کائنات آج بھی ساری ہے معطر اس سے
پھیلی افلاک میں کیسی شبِ اسریٰ خوشبو

نعت کہتے ہوئے کردار بدل جاتا ہے
نعت میں ڈوب کے ہوتا ہے رویہ خوشبو

کِھل اُٹھیں پھول اگر صدق و صفا کے اس میں
پھر تو ہو میرا وطن سارے کا سارا خوشبو

رات دن جس کا وظیفہ ہو ثنائے خواجہؐ
اس کے انفاس سے آتی ہے ہمیشہ خوشبو

جو بھی جاتا ہے وہ آتا ہے معطر ہو کر
بانٹتا رہتا ہے یوں گنبدِ خضرا خوشبو

وقف جب مدحتِ سرکارؐ دو عالم میں ہوئے
ہو گئے لفظ مرے پھول، ستارہ، خوشبو

پیکرِ نعت میں ڈھل جائے قمر آخرِ کار
جب بھی ہوتی ہے مری سوچ میں یکجا خوشبو

محمد یٰسین قمر

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

الٰہی! کون مٹا دین کی بقا کیلئے
یہ کس نے جامِ شہادت پیا وفا کیلئے
یہ کس نے کر دیا قربان گھر کا گھر اپنا
یہ کس نے جان لُٹا دی تری رضا کیلئے

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کے لئے

ہنوز تشنہ تھی روحِ پیامِ ربِ جلیل
ہنوز تشنہ و مبہم تھی زندگی کی دلیل
ہنوز تشنہ تکمیل تھا مذاقِ خلیل
حصولِ مقصدِ تعلیمِ انبیاء کیلئے

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

قیامِ فصلِ بہاراں کا کام باقی تھا
علاجِ تنگیٔ داماں کا کام باقی تھا
ابھی نقاہتِ ایماں کا کام باقی تھا
شعورِ حکمتِ قرآں کی انتہا کیلئے

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

بھٹک رہا تھا اندھیروں میں کاروانِ رسول
اسیرِ دامِ مصائب تھا خاندانِ رسول
امیر و حاکم و سلطاں تھے دشمنانِ رسول
تحفظِ حرم و دینِ مصطفیٰ کیلئے

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

اسیرِ حلقۂ دشمن تھے مہوشانِ حرم
اجڑ رہے تھے خیابان و گلستانِ حرم
بنے ہوئے تھے سیہ کار پاسبانِ حرم
حرم کی حرمت و تقدیس کی بقا کیلئے

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

حیا کا نام مٹا جا رہا تھا دنیا سے
وفا کا نام مٹا جا رہا تھا دنیا سے
خدا کا نام مٹا جا رہا تھا دنیا سے
فروغِ سنت و پابندیٔ وفا کیلئے

حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

فنا سے دست و گریباں تھا زندگی کا وقار
ملا رہی تھی ہوس خاک میں خودی کا وقار
سوالِ عظمتِ خاکی تھا آدمی کا وقار
عروجِ آدمِ خاکی کی انتہا کیلئے
حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کیلئے

سید فخر الدین بلّے

سلام

بہم لہو کے ہیں موتی نمودِ نم کے لیے
قلم دوات ہیں گریاں حسینی غم کے لیے

حسینؑ خواب میں دیکھے تو حسرتیں نکلیں
جو میں نے پاؤں کے بوسے ہیں محترم کے لیے

کتاب جلوہ نمائے حسینؑ ہو جائے
مطالعہ ہو محبت بھرا صنم کے لیے

حسینؑ نام سے جو حرفِ التماس لکھے
دعا نے ٹوٹ کے بوسے مرے قلم کے لیے

عرب میں نازِ قیادت غمِ حسینؑ ہوا
حسینؑ شانِ شہادت ہوئے عجم کے لیے

غریب و سادہ سی لکھی ہے داستانِ حرم
کوئی بیان نہیں اس میں پیچ وخم کے لیے

سلام درد کے احسان سے لکھو ثاقب
غمِ حسین ہو تحریرِ کیف و کم کے لیے

آصف ثاقب

سلام

یزیدی عہد ہے امت کی رسوائی نہیں جاتی
حسینیت کے دعوے ہیں کہیں پائی نہیں جاتی

کوئی جب رزم و بزمِ کربلا کا راز پا جائے
تو پھر جو سوچ میں آتی ہے گہرائی نہیں جاتی

یہاں جھک جائیں جو سرتاجِ درویشی انھیں زیبا
وہ کیا پائیں کہ جن سے بوئے دارائی نہیں جاتی

یہ راہِ عشق و مستی ہے میاں اس راہ میں دل کیا
قلم سے بھی توازن کی قسم کھائی نہیں جاتی

قیام و صبرِ شبیری کا سورج بجھ نہیں سکتا
یزیدی جبر کی جب تک ستم زائی نہیں جاتی

کبھی پڑھ کر انیسِ غم سرا کے مرثیے دیکھو
تمھیں کس نے کہا دل پر جمی کائی نہیں جاتی

سرِ الواحِ جان و دل ولا شاہِ شہیداں کی
منیمِ بخت خود لکھتا ہے لکھوائی نہیں جاتی

سمجھ پائے کوئی کیا رتبہ سبطِ پیمبر کو
کہ اِس اوجِ ضیا تک موجِ بینائی نہیں جاتی

اُدھر سچی عقیدت ہی کو اذنِ باریابی ہے
وہاں عالی ہماری حرف آرائی نہیں جاتی

جلیل عالی

منقبت امام حسینؑ

ہمیں عزیز نہ کیونکر ہو، غم حسینؑ کا ہے
اُسی نواسۂ شاہِ اُمم، حسینؑ کا ہے

ہیں مطمئن ، متعین ہے راستہ اپنا
ہمارے سامنے نقشِ قدم حسینؑ کا ہے

یہ سانحہ تھا کہ وہ لشکرِ یزید میں تھا
یہ معجزہ ہے کہ حُر ہم قدم حسینؑ کا ہے

زباں سے اور قلم سے بیاں کریں جتنا
مقام اُس سے کہیں محترم حسینؑ کا ہے

یزید حرفِ غلط تھا، سو مٹ چکا کب کا
زمانہ اب بھی خدا کی قسم، حسینؑ کا ہے

یزیدی قوتیں اب بھی ہمارے درپے ہیں
ہمارے ہاتھوں میں اب بھی عَلَم حسینؑ کا ہے

تو کیوں نہ اپنے لہو میں اِسے ڈبو کے لکھیں؟
بیان جب سرِ نوکِ قلم حسینؑ کا ہے

خدا کرے، یہ کسی دوسری طرف نہ اٹھے
مرا وہی ہو قدم جو قدم حسینؑ کا ہے

نصیب ہو گئی تفہیمِ کربلا جب سے
یہ جاں حسین کی ہے، اور یہ دم حسینؑ کا ہے

نسیمؔ دل میں سماں کیوں نہ ہو چراغاں کا!
ہمارے دل میں مکیں جب الم حسینؑ کا ہے

نسیمِ سحر

سلام

آئندہ کی لو میں ڈھل رہا ہے
بجھ کر بھی چراغ جل رہا ہے

کیا زندہ سفر ہے کربلا کا
ہر دور کے ساتھ چل رہا ہے

شاید ہے یزیدِ عصر جس کو
کردارِ حسین کھل رہا ہے

بازی ہے عجیب جس میں فاتح
افسوس سے ہاتھ مل رہا ہے

اک اسم ہے جس کی برکتوں سے
آ آ کے عذاب ٹل رہا ہے

اک سجدہ خلوص کی بدولت
تاریخ کا رُخ بدل رہا ہے

رحلت نہیں کشتۂ ستم کی
تہذیب کا دم نکل رہا ہے

گلزار ہوں شاخ اس شجر کی
کٹ کر بھی جو پھول پھل رہا ہے

گلزار بخاری

سلام بہ کربلا

اے فلکِ کربلا، تشنہ لب و تشنہ کام
دیکھ سرِ دشت ہے سبطِ رسولِ انامؐ

قافلۂ صدق کا شاہ سوارِ عظیم
راحلۂ صبر کا راہ برِ خوش خرام

دیکھ تری خاک پر کس کا گرا ہے لہو
کس نے لٹایا ہے گھر، کس کے جلے ہیں خیام

اے نگہِ دشتِ شام! دیکھ ذرا غور سے
اپنے شہیدوں کا خوں، اپنے اسیروں کی شام

کس نے بتایا تجھے، کس نے دکھایا تجھے
کذب بیانوں پہ ہے کارِ شجاعت حرام

سبطؓ نبیؐ کے سوا، ابنِ علیؓ کے سوا
کون ہوا سرخ رُو، کس کو ملا ہے دوام

تیرے کفِ گِل پہ ہے لمسِ قدومِ حسینؓ
رہ گزرِ کربلا! تجھ پہ ہزاروں سلام

خالد علیم

سلام یا حسین

نام میرے لب پہ آیا جس گھڑی شبیر کا
گوشہ گوشہ ہو گیا روشن دلِ دلگیر کا

گل ہوئیں باطل کی شمعیں جل اٹھی قندیلِ حق
یوں ہوا شہرہ جہاں میں نعرۂ تکبیر کا

یوں بہتر تن سروں پر باندھ کر نکلے کفن
پانی پانی ہو گیا خونِ جگر شمشیر کا

اے حسین ابنِ علی تیری شجاعت کو سلام
تیرا خوں غازہ بنا اسلام کی توقیر کا

آج بھی نادم ہے زنداں عابدِ بیمار سے
حلقہ حلقہ رو رہا ہے آج بھی زنجیر کا

جب سے رنگیں ہوگئی آلِ عبا کے خون سے
کربلا کی خاک رکھتی ہے اثر اکسیر کا

خون سے روشن کئے اقبال طوفاں میں چراغ
''حق ہے ممنونِ کرم قربانیٔ شبیر کا''

اقبال سروبہ

سلام

زہرا کا لال ، وارثِ حیدر نہیں رہا
ماتم کہ وہ ، شبیہِ پیمبر ، نہیں رہا

تیری فضا میں گونج رہی ہے اذانِ عصر
اکبر نہیں رہے ، علی اصغر نہیں رہا

رَچ بس گیا ہے جسمِ معطر یہیں کہیں
لیکن نشانِ قاتل و خنجر نہیں رہا

ارض و سما کے تختِ عبادت پہ اب فقط
سجدہ پڑا ہوا ہے مگر سر نہیں رہا

تجھ کو مرے حسینؑ نے گھر ہے بنا لیا
کہتا ہے کون ان کا کوئی گھر نہیں رہا

زینبؑ نے آسمان کو اوڑھا تھا جس گھڑی
بے چادری کا ، تب سے کوئی ڈر نہیں رہا

ہم اُس حصارِ جبر میں محبوس ہیں جہاں
دیوار رہ گئی ہے کوئی در نہیں رہا

شاہین مفتی

سلام

راحت سرحدی

ذکرِ شبیر سے نکل آیا
خُون تحریر سے نکل آیا

دیکھتا تھا فُرات وہ چشمہ
جو رگِ پیر سے نکل آیا

گل شدہ اک چراغِ خیمہ بھی
بڑھ کے تنویر سے نکل آیا

روح نکلی غبار سے دل کے
جسم زنجیر سے نکل آیا

وہ شہادت کہ جس میں خوں کی جگہ
نور ہر چیر سے نکل آیا

اس کو تلوار نے لیا راحت
بچ کے جو تیر سے نکل آیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عجزِ کمالِ فن لیے ، فکرِ جمالِ فن لیے
شیش محل تک آ گئے آئنہ گر ، برہنہ پا

حسین ابن علیؓ

تو محبت کا پیامی ہے حسین ابن علیؓ
تیری جرات کو سلامی ہے حسین ابن علیؓ

جامۂ صبر و رضا پہنے سر نوک سناں
تیری قرآن کلامی ہے حسین ابن علیؓ

عظمت آثار ترا نقش قدم ہے مولا
خواجگی تیری غلامی ہے حسین ابن علیؓ

فیض ملتا ہے یہاں شاہ و گدا کو یکساں
رہبر خاصی و عامی ہے حسین ابن علیؓ

حشر تک سارے یزیدوں کے لئے مرگ اثر
آپ کا اسم گرامی ہے حسین ابن علیؓ

وقت نے جیسے ترے ہاتھ پہ بیعت کی ہے
ہر زمانہ ترا حامی ہے حسین ابن علیؓ

جس میں کچھ نور ہدایت کی رمق ہے موجود
تو ہر اس دل کا مقامی ہے حسین ابن علیؓ

دنیا داروں کی خوشامد کروں کیسے سرور
جب مرا مونس و حامی ہے حسین ابن علیؓ

سرور حسین نقشبندی

سلام

نبیؐ کے خوں کا اثر یوں دکھا گئے ہیں حسینؑ
خدا کے دین کی عظمت بڑھا گئے ہیں حسینؑ

ہر ایک دور میں مظلومیت کی چوکھٹ پر
سرِ غرورِ یزیدی جھکا گئے ہیں حسینؑ

بہیں گے دیدہ عالم سے حشر تک آنسو
دلوں کو دردِ مجسم بنا گئے ہیں حسینؑ

سلام کرتی ہے اُنکو نماز اور سجدہ
خدا کی راہ میں یوں سر کٹا گئے ہیں حسینؑ

مُحرم آتا ہے جب بھی تو ایسا لگتا ہے
ہماری مجلسِ غم میں پھر آ گئے ہیں حسینؑ

انھیں بُجھا نہیں سکتی یزیدیت کی ہوا
دیے جو اپنے لہو سے جلا گئے ہیں حسینؑ

شعورِ درد کا حاصل ہے روزِ عاشورہ
ہمیں رموزِ حقیقت سکھا گئے ہیں حسینؑ

جگہ کہاں ملے ظلمت کو منہ چھپانے کی
کہ رُوئے ظلم سے پردہ ہٹا گئے ہیں حسینؑ

ہمیں بتاتی ہے تاریخِ کربلا شب و روز
خدا کے نام کا ڈنکا بجا گئے ہیں حسینؑ

فرات روئے گا تا حشر خون کے آنسو
کہ اُس میں اپنے لہو کو ملا گئے ہیں حسینؑ

شکست دے دی ہے لشکر کو چند پیاسوں نے
جہاد اپنے عمل سے دکھا گئے ہیں حسینؑ

تبسمِ علیؑ اصغر کی تیغ سے طاہر
یزیدیت کے پرخچے اُڑا گئے ہیں حسینؑ

طاہر ناصر علی

سلام

اضطرابی ہے ، فلک پر کربلا تیار ہے
پرسہ داروں کے لیے فرشِ عزا تیار ہے

ہر طرف سے اک صدائے العطش ہے دشت میں
قتل گاہِ سلسلہء انبیا تیار ہے

یہ شہیدوں کے لہو کا ہے اثر کہ حشر تک
ہر مرض کے واسطے خاکِ شفا تیار ہے

مصطفےٰ کے گلعزاروں کے لیے پردیس میں
دکھ یہی ہے لشکرِ اہلِ جفا تیار ہے

حرملہ کے روبرو بھی مسکرانے کے لیے
دستِ سبطِ مصطفےٰ پہ خوش ادا تیار ہے

کانپتی ہے اب سپاہِ اشقیہ اس خوف سے
برچھیوں کے سامنے اک بینوا تیار ہے

پرچمِ عباس کا سایہ رہے ہم پر اسد
اب جفاکاروں سے اپنی بھی وغا تیار ہے

اسد اعوان

تعلق والی راہ

یوں تو زندگی میں بہت سے راستے بہت سی راہیں سامنے ہوں گی مگر تعلق والی راہ بھی کیا خوبصورت اور کیسی کیف آور ہے کہ اس راہ میں آنے والی رکاوٹیں بھی راستے کے سنگ میل ہیں سد راہ نہیں یہ دشوار گزار راہیں بھی چاہنے والوں کی نظر میں پھولوں بھری راہ گذر جیسی ہوتی ہیں۔

تعلق اگر حقیقی ہو تو اک روشنی ہے جو رب کریم تک لے جاتی ہے یہی آدب خود آگاہی سکھاتی ہے اسی کی وجہ سے غلاموں پر اسرار شہنشاہی کھلتے ہیں جب یہ تعلق اداب خود آگاہی سکھاتا ہے تو بندہ اپنے ہونے کی وجہ جان لیتا ہے پھر وہ بلدیاتی سوچیں چھوڑ کر آفاقی سوچیں سوچتا ہے بندے اور رب کی یہ گہری محبت یا تعلق کی راہ ہی کائنات کے ،، کن ،، کا نقطہ آغاز تھی رب نے یہ کائنات اپنے تعلق اپنی محبت اور اپنے عشق کی پہچان ہی کے لئے بنائی۔

حقیقی تعلق کا مرکز اور سرچشمہ رب کریم کی ذات بھی ہے اور ان کی صفات بھی ہیں یہ جذبہ خود رب کریم اپنے منتخب اور پاکیزہ بندے میں پیدا کرنا ہے کیسے پیدا کرتا ہے؟ یہ بھی عجیب کرشمہ ہے کہ تعلق کیسے پیدا ہوتا ہے یہ تعلق کیا کچھ کروا سکتا ہے؟ آج ایک وڈیو دیکھی تو یہ بات بہت حد تک سمجھ آ گئی

سلیمان عبداللہ ڈار

آیئے آپ کو بھی دکھاتے ہیں۔
یہ اک واٹس ایپ گروپ ہے جس میں 300 سے زائد کلاس فیلوز شامل ہیں 34 سال پہلے ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر کے بعد ہم سب بکھر گئے نشتر میڈیکل کالج کی اک خوبصورت روایت ہے کہ 25 سال گریجویشن کے بعد گزر جائیں تو کالج والے اور پرانے دوست مل کر سلور جوبلی فنکشن کرتے ہیں اس میں کوئی پرانے استاد اسی طرح کلاس کی حاضری لگاتے ہیں جیسے 25 سال پہلے لگایا کرتے تھے اسی واٹس ایپ گروپ میں ابھی ایک وڈیو میرے سامنے ہے کہ رب کا تعلق اور اس تعلق والی راہ کیا کچھ کروا سکتی ہے کہتے ہیں کہ وہ بہت جلدی میں تھا جب ایئر پورٹ پہنچا بھاگم بھاگ اس نے امیگریشن کاؤنٹر سے پاسپورٹ کلیئر کروایا اور دوڑتا ہوا فلائیٹ تک پہنچا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے لمبی سانس لی۔ وہ ایک معروف سرجن تھا اس کی بین الاقوامی مشہوری براعظموں کو پھلانگ چکی تھی جس شہر کو یہ فلائیٹ جا رہی تھی وہاں اس کے اعزاز میں ایک میڈیکل کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی تھا مگر یہ امر خوش آیند تھا کہ فلائیٹ بروقت اس شہر میں اتر جائے گی جہاں ہزاروں مندوبین اس کے منتظر تھے۔
مگر یہ کیا؟ کیپٹن کی آواز فلائیٹ میں ابھری
"ہم معذرت خواہ ہیں جہاز طوفان بادو باراں اور ایک ایسے پاکٹ ایریا میں ہے کہ ہمارے ریڈیو سسٹم نے کام چھوڑ دیا ہے مجھے مجبوراً قریبی ایئر پورٹ پر ہنگامی لینڈنگ کرنا ہوگی۔"
جہاز نے لینڈ کیا تو ڈاکٹر پریشان حال تھا پائیلٹ سے جا کر ملا اور بتایا
"ہزاروں شائقین اور میڈیکل سٹوڈنٹ اس کی راہ دیکھ رہے ہیں اسے کانفرنس میں ضروری پیپر پڑھنا تھے۔"
پاس کھڑے مسافروں نے اسے پہچان لیا ایک مسافر بولا:
"آپ مشہور ڈاکٹر جسانت صاحب ہیں نا؟
"ہاں" اس نے پریشانی میں کہا۔
"جس شہر میں آپ کی کانفرنس ہے وہ یہاں سے صرف 3 گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔"
ڈاکٹر کی آنکھوں میں روشنی امڈ آئی تیزی سے اک ٹیکسی لی اور عازم سفر ہوا پائیلٹ کی بات ٹھیک تھی تیز بارش اور آندھی میں ٹیکسی کا چلانا دوبھر تھا مگر اس نے ڈرائیور کو چلتے رہنے کی ہدایت کی۔
کچھ دیر بعد ٹیکسی ڈرائیور نے افسوس سے کہا
"ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔"
سڑک ویران تھی سامنے اک گھر نظر آیا انھوں نے ٹیکسی روکی ڈاکٹر تیز بارش میں بھیگتا اس مکان کی طرف دوڑا، دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی،
"جو بھی ہے اندر آ جائے۔"
اس نے اندر جا کر دیکھا ایک بڑھیا مصلے پر

بیٹھی نماز پڑھ رہی ہے اس نے گھبراہٹ میں پوچھا:

''یہاں کوئی فون ہوگا؟ مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

بڑھیا مسکرا کر بولی

،،بیٹا کون سا فون یہاں تو نہ بجلی ہے نہ فون! ہاں سامنے میز پر چائے رکھی ہے اک پیالی پیو ذرا تمھاری تھکان اتر جائے گی کوئی پریشان حال مسافر لگتے ہو کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔''

ڈاکٹر نے دیکھا کہ جائے نماز کے پاس کوئی چار پانچ سال کا بچہ پڑا ہوا ہے جسے بڑھیا تلاوت کرتے ہوئے تھوڑی دیر بعد ہلا دیتی ہے۔

،،یہ بچہ کون ہے ڈاکٹر نے پوچھا''

،،بس مسافر کیا بتاؤں بڑھیا بولی کہ یہ میرا پوتا ہے اس کی ماں مر گئی باپ بھی نہیں اسے کوئی بڑا عجیب وغریب مرض ہے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا،،

پھر انہوں نے کیا کہا،،

بڑھیا بڑے دکھی لہجے میں بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی

،،سبھی ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ اس کا علاج صرف ایک ڈاکٹر کے پاس ہے اسے بڑا موذی کینسر ہے جس کا آپریشن صرف ڈاکٹر جسانت ہی کر سکتے ہیں اور اب مسافر! تم ہی بتاؤ میں اک بے آسرا بڑھیا ڈاکٹر جسانت تک کیسے پہنچ سکتی ہوں۔ چلئے پہنچ بھی جاؤں تو پتہ نہیں وہ بچے کا معائنہ کرے یا نہ کرے بس میں تو اس کے لیے روز دعا ہی کر سکتی ہوں وہی اب بھی کر رہی ہوں رب سے اک تعلق کی راہ استوار کر رہی ہوں۔

مسافر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

،،روکیوں رہے ہو مسافر؟ ہمارا اللہ وارث ہے میرے پاس وسائل نہیں تو کیا وہ تو قادر مطلق ہے،،

ڈاکٹر نے دھاڑیں مارتے روتے ہوئے کہا ہاں،،اماں جی آپ کے تعلق نے بلندیوں پر اڑتے ہوئے جہاز کے گرد بجلیاں برساتے بادل اکٹھے کیے اسی تعلق نے جہاز کو ہنگامی لینڈنگ پر مجبور کیا پھر میری ٹیکسی والے کو راستہ بھلوایا مجھے آج یقین آ گیا کہ اصل چیز یہ تعلق ہی ہے بس تعلق ہی ہے۔

تعلق والی یہ راہ پریت میں ڈھل جائے تو پریتم کا تن من دھن محبت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے بھگت کبیر بڑے معروف اللہ والے ہیں اسی سلسلے میں فرماتے ہیں:

پریتم ایسے پریت نہ کریو جیسے کرے کھجور
دھوپ لگے تو سایہ ناہی بھوک لگے پھل دور

.....

پریت کبیرا ایسی کریو جیسی کرے کپاس
جیو تو تن کو ڈھانپے مرد نہ چھوڑے ساتھ

.....

پریت نہ کریو پنچھی جیسی جل سوکھے اڑ جائے
پریت تو کریو مچھلی جیسی جل سوکھے مر جائے

.....

مخلوق کی پریت مخلوق سے اور ہے مخلوق سے رب کی محبت یا رب کی مخلوق سے محبت والا جذبہ قطعی مختلف ہے بندہ محنت کر کے تعلق والی اس راہ کو پا نہیں سکتا یہ تو بس عطا ہوتا ہے یہ اک انوکھا جہاں ہے جہاں قابلیت نہیں قبولیت دیکھی جاتی ہے رب کا اور بندے کا سب سے خوبصورت رشتہ یہی پریت ہے یہی بندے کی معراج ہے بندے کے لیے اس سے اونچا یا اس سے آگے والا کوئی مرتبہ ہے ہی نہیں عشق حقیقی والی راہ اس کائنات کے سب سے بڑے سربستہ راز کا ایسا بحر بیکراں ہے جس کی کوئی حد ہے نا ہی سرحد نہ کوئی انت ہے نہ اندازہ یہ بے انت ہے یہی وجہ ہے کہ اس حقیقی تعلق والی راہ تک جانے والے رستوں کی بھی کوئی گنتی ہے نہ شمار! ہاں اس کے لئے سچائی من کی چاہت دل کی روشنی اللہ کی وحدانیت کا اقرار رسالت کی گواہی سخاوت کی خواہش بھوکے کو کھانا کھلانے کی کوشش بے آسرا کی امداد اپنی ذاتی گارنٹی پر کسی غریب کی بیٹی کی شادی کروانا اور حیا والی نظر رکھنا اس راہ کا توشہ ہیں۔

سعادت جن کے بخت میں لکھ دی گئی تھی رب خود ہی ان کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اسے وہبی کہتے ہیں رب کریم سے تعلق والی اس راہ کو بہر حال قرآن وسنت اور شریعت کی حدود ہی میں رہنا ہوگا نبیؐ کے طریقہ کو کسی بھی حال میں نہیں چھوڑنا پھر یہ تعلق مضبوط ہوگا۔ عشق حقیقی اس کائنات کی سب سے بڑی کشش ہے اس راستے کا راہی پھر دوسری سب راہیں چھوڑ دیتا ہے پھر وہ صرف اور صرف اسی تعلق والی راہ ہی کا مسافر ہوتا ہے اس مسافر کا رشتہ رب سے شروع اور رب ہی پر ختم ہوتا ہے وہ کسی اور سمت میں سفر کر ہی نہیں سکتا خالق اور مخلوق کے درمیان اس سے بڑا اور اس سے مضبوط اور کوئی رشتہ نہیں عبادت محبت خدمت تلاوت ذکر دین حنیف کے علم کا حصول روحانی کشش قرآن مجید پر غور وخوض اور اللہ والوں کی صحبت اس راہ کے سنگ میل ہیں سچے مسافر کو سنگ میل کا پتہ ہوتا ہے اور سنگ میل بھی سچے مسافر کو پہچانتے ہیں کہ یہ مسافر پھر چاہے بھی تو راہ سے ہٹ نہیں سکتا کہ اس راہ کا کیف وسرور بھی مثالی ہے کیونکہ اس کا مرکز خود اللہ جل شانہ ہیں اور دین کا علم اس راہ کی روشنی ہے۔

اگر کوئی سمجھتا ہے کہ رب سے تعلق کی راہ قرآن وسنت کے علاوہ کسی راستے سے آسکتی ہے تو وہ امام الجاہلین ہے اور کوئی راہ ہے ہی نہیں یہی محبت کی راہ ہے یہی ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی والی راہ ہے بعض جاہل صوفیوں میں مخلوق سے کٹ کر چلہ کاٹنا جنگلوں میں بیٹھ کر اللہ ہو کرنا معمول بنتا ہے جبکہ دین اسلام میں رہبانیت ہے ہی نہیں۔ رب کی یاد اور سجدوں کی مٹھاس ہی اک ایسا راستہ ہے جس سے رب کو پایا جا سکتا ہے

اس راستے پر چلنے والا اک نہ اک دن خود کو محبت کی ندی میں بہتا ہوا پائے گا لوگ تو یونہی کھنڈر کو ویران سمجھتے ہیں حالانکہ اصل کھنڈر وہ دل ہے جس میں رب کی یاد نہیں کبھی اپنے اندر جھانک کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ بہت سی صلاحیتوں کا تو آپ کو علم ہی نہیں یہ اک سنگین غفلت ہے اور کسی بھی غفلت کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے نوافل کی کثرت اس راہ کو آسان کرے گی کیونکہ نوافل فرائض پر مائل کرتے ہیں مائل وہی ہوتا ہے جو سیکھنا چاہے پیاس محسوس کرے تو ہی کنوئیں تک جائے گا خود کو بے علم سمجھنا ہی علم کی پہلی سیڑھی ہے۔

خوبصورت اخلاق سے بہتر کوئی تزئین و آرائش نہیں دل کی یہ آزمائش ہی تعلق والی گلی کا حسن و جمال ہے یہی دلفریب گل کاری ہے اسی سے روح کے ہر کونے میں انجمن آرائی ہوگی اکثر اک سوال دل میں ابھرتا ہے - دنیاوی تعلق میں تو محبت کا جواب بھی محبت سے مل سکتا ہے مگر رب کریم کوئی ذات تو ہے نہیں یا بے مثل ذات ہے اور پھر ملنے کے لیے قربت ضروری تو نہیں ہوا کرتی۔

تعلق کی راہ استوار ہو جائے تو زندگی کے ہر ہر شعبہ میں تعلق محبت اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے نیکی کی تلاش کو جی چاہتا ہے اک واقعہ یاد آ گیا حضرت عمرؓ کے دور میں جب فتوحات کا دروازہ کھلا تو صحابہؓ کرام جن جن ملکوں میں جہاد کے لیے جاتے وہیں دعوت دین کے سلسلہ میں قیام کر لیتے ایک صحابیؓ نے ایسے ہی ایک ملک میں تجارت شروع کی دکان تو پھر چلتے چلتے چلتی ہے چند سال بعد کاروبار جم گیا تو اک روز اک گاہک سودا واپس کرنے آ گیا۔ صحابیؓ نے الحمدللہ کہا خوشی خوشی سودا واپس کیا گاہک چلا گیا تو فرمایا

،،دکان بند کر دیں اب یہ کاروبار نہیں کرنا،،

احباب پوچھنے لگے! اب تو کاروبار چل نکلا تھا اب اسے بند کیوں کر رہے ہیں،، تو فرمایا:

،،دکان داری کے لیے تو کی ہی نہیں تھی دراصل ایک بار میں نے اللہ کے سچے رسولؐ سے سنا،، جو دکاندار بیچا ہوا مال صرف اللہ کی رضا کی نیت سے واپس کر لے میں محمدؐ یہ اعلان کرتا ہوں کہ کل کو جنت کے درمیان میری اور اس کی ملاقات طے ہوگئی،،

اس صحابیؓ نے گاہک کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

،،تیرا تو برسوں سے انتظار تھا،،

تعلق کی راہ ہی ایسے اجر والے خوبصورت اعمال پر ابھار سکتی ہے اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ ہمارے اندر بہت سی کوتاہیاں موجود ہوتی ہیں مگر جس راہ کا میں نے اس تحریر میں ذکر کیا اس پر چلنے کی کوشش رب کریم سے محبت کے دلفریب اور دیدہ زیب رشتے کا دروازہ کھول سکتی ہے دروازے کھل جائیں تو راہیں آسان ہوتی جایا کرتیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم

مثنوی اپنے فن کے اعتبار سے چند دو چند خصوصیات رکھتی ہے۔ اسی کا اظہاری قرینہ منفرد و متعین ہے۔ مثنوی کے آثار دکنی ادب میں قرار پائے ازاں بعد اردو ادب میں دو مثنویاں زیادہ مشہور ہوئیں۔ درس و تدریس میں ان کو زیادہ اہمیت ملی۔ یہ میر حسن کی سحر البیان اور دیا شنکر نسیم گلزارِ نسیم شد و مد کے ساتھ پڑھی گئیں اور پڑھائی گئیں۔ دونوں کے مابین جو تفریقی عوامل تھے ان کو تحریری اور زبانی طور پر زیر بحث لایا گیا۔ سحر البیان سے وقت کی معاشرتی اقدار تصویر کشی ہوئی اور گلزار نسیم سے اظہاری تکلف اور زیبایش کے طور طریقے اجاگر ہوئے۔ ہیئت اور طرزِ بیاں کے نقطۂ نظر سے مثنوی گلزار نسیم سے متعلق اس وقت بات ہوگی۔ بالعموم مثنوی گلزار نسیم مباحث میں نسبتاً کم آمیز رہی ہے۔ اس باب میں اس کی بندشیں اختصار اور تکلف رکاوٹ کا سبب رہے ہیں۔ حسنِ اختصار اور تحمل بیان اور کہانی پر گرفت کو دیکھا جائے تو یہ مثنوی بلند و بالا نظر آئے گی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے کتاب ''دعا سے اقبال تک'' کے مضمون گلزارِ نسیم میں اس مثنوی کو انکار و اقرار کی اعترافی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ مضمون کے شروع میں ان کا محاکمہ ہے ''نسیم کے مخصوص طرزِ بیان نے ان کی داستان گوئی کو نقصان پہنچایا ہے وہ داستان گوئی کے سب تقاضے پورے نہیں کر سکے اس لیے کہ داستان گوئی ایک خاص طرز بیاں ہے۔ یعنی سادہ بے تکلف اور رواں طرزِ اظہار کی متقاضی ہے یہ تقاضا انھوں نے پورا نہیں کیا۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون میں دیا شنکر نسیم کے معترف بھی ہیں۔ مستر دیدی محاکمے کے ساتھ تائیدی ارشادات بھی وہ وارد کر رہے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''گلزار نسیم کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ اس میں نسیم پر تکلف طرز بیان کو کامیابی کے ساتھ نباہ سکے ہیں۔ شاعری اپنے منصب کے اعتبار سے کچھ بھی ہو اور اس کے نقطۂ نظر سے نسیم کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ شاعر نے صنعت گری کا بڑا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ اور اس کی دشواریوں کے باوجود اس سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔''

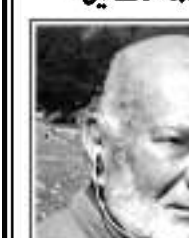

آصف ثاقب

ڈاکٹر سید عبداللہ نے صنعت گری اور دشواریوں کا ذکر کیا ہے اس ضمن میں نسیم کا عروضی استحسان بھی مذکور ہونا چاہیے۔ مثنوی گلزار نسیم کا میڈیم اختصار اور تکلف میں ادائی اور پرزیائی کے جوہر پیدا کرتا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم بحر ہزج فروع سہ رکنی اظہارات میں ہے، جو یہ ہیں:

1- مفعول، مفاعلن، فعولن (مفاعیل) اخرب
2- مفعولن، فاعلن، مفعولن (مفاعیل) اخرم

ان کے اظہارات کے پس منظر میں تعقل، متزدد، تصور اور تکلف کے بے بہا قرینے موجود ہیں۔ ان قرینوں کو دیا شنکر نسیم نے بڑی ہوشیاری سے منضبط کیا ہے اس کی داد انھوں نے آتش سے بھی حاصل کی۔ اس ادعا کی مناسبت سے مثنوی گلزار نسیم کے کچھ اشعار درج ہیں:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
دونوں کی رہی نہ جان تن میں
کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

.....

(دوسرا مصرع روزمرہ کے استعمال میں ہے بالعموم لکھا اور بولا جاتا ہے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں) جملہ معترضہ

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں
غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ قسمت
پوچھا کہ طلب؟ کیا قناعت
باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ
لایا بصد امتیاز ہمراہ
ہم چشم پھرے تھے مثل مژگاں
ہمسایہ تھے کشیدہ داماں
جس طرح انھیں بہم ملایا
بچھڑے ہوئے ملیں سب خدایا
جو نخل تھا سوچ میں پڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

.....

شنید ہے مستند استادِ غزل سیف الدین سیف اپنے شاگردوں کو (جو بڑی تعداد میں تھے) اصطلاحِ سخن کے مدارج میں اس بات کا اہتمام بطور خاص کرتے تھے کہ انھیں ہدایت دیتے تھے کہ اور مطالعوں کے ساتھ ان ''نگارشات'' کو خاص طور پر نظر میں رکھیں۔ ان سے زبان و بیان اور جذبات نگاری کو بہت سہارا ملے گا۔

1- مراثی انیس
2- مثنوی گلزار نسیم
3- فسانۂ آزاد
4- کلام داغ

مثنوی گلزارِ نسیم اور فسانۂ آزاد اظہار میں ادبی شان و تمکنت کے لیے مراثی انیس شدتِ احساس کے لیے
کلام داغ زبان دانی اور وسعتِ بیاں کے لیے

☆☆☆☆☆

ولایت چلتے ہیں [سفرنامہ]

مختلف اوقات میں برطانیہ کے مختلف شہروں کے ساتھ ساتھ ایران کے اسفار کے دوش بدوش مصنفہ نے جس فکری دل آویزی کے ساتھ داخلی مظاہر کی نو بہ نو کیفیات کو اپنے پُر اسلوب بیانیے کا حصّہ بنایا ہے اُس نے ولایتی ماحول کو دیسی مزاج سے ہم رشتہ کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ عمدہ منظر نگاری، اشعار کے برمحل استعمال، محاوروں، تشبیہات اور استعاروں کے فنی برتاؤ اور تقابلی مماثلتوں کی خوبیوں نے اسے دلچسپ ہی نہیں حسّی اعتبار سے بھی پُر مایہ بھی بنایا ہے۔

یہ افسانوی اسلوب جس میں شاعرانہ طرز نگارش مختصر مگر بامعنی اظہار کی جوت جگاتی، برطانیہ اور ایران کی رنگا رنگ ثقافتی، تاریخ اور جغرافیائی مناظر کا کھوج لگاتی آگے بڑھتی ہے، اپنے فنی اظہار کے باوصف ہمیں بیگم اختر ریاض الدین کے باکمال سفرناموں ''دھنک پر قدم'' اور ''سات سمندر پار'' کی یاد دلاتی ہے۔

مشرف مبشر صاحبہ ایک اسم بامسمّیٰ سفرنامہ نگار ہیں، یوں کہ جس طرح ان کے نام میں غنائی کیفیت بسی ہوئی ہے اسی طرح ان کے نغمہ بار اسلوب میں ایرانی ثقافت کی کلاسیکی اور مذہبی مطالعاتی جھلک اور گوروں کے دیس کی آگہی کا فیضان رچا بسا ہے۔

خیبر پختون خوا سے علاقائی نسبت رکھنے والی خواتین سفرنامہ نگاروں میں ان کا ادبی اختصاص یہ ہے کہ زیرِ نظر سفرنامے کی اشاعت کے بعد، ان کے سفرناموں کی تعداد تین ہوگئی ہے۔ یہ تعداد عددی فوقیت ہی کی حامل نہیں ہے بلکہ خیبر پختون خوا میں سفرنامہ نگاری کی وہ روایت (جس کا آغاز معروف سفرنامہ نگار محترمہ قدسیہ قدسی نے اپنے اولین سفرنامے ''گردِ سفر'' مطبوعہ 1993 سے کیا تھا) کی نمائندہ ہے۔ وہ اس روایت میں ایک خوبصورت اضافے کا سبب قرار پانے کی مستحق ہیں۔

محترمہ مشرف مبشر کے اس تیسرے فکر انگیز سفرنامے میں جہاں اسلوب کی دل نشینی متاثر کرتی ہے وہاں پیش کش کے اعتبار سے بھی ایک منفرد اور ممتاز ادبی کاوش قرار پائے گی جس پر میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نثار ترابی

ماجد یزدانی کا شعری کینوس

تجھ سے جدا ہوئے تو مجھے عمر ہو چکی،،،،،،لیکن تیرا خیال، میرے ساتھ ساتھ ہے

معاصر عہد کے شعری رویے، ادبی میلانات، عقلی اور فکری ضابطے نو جدلیاتی فلسفے کی دین ہیں۔ نو جدلیاتی فلسفہ جو سماجوں کے ثقافتی اور تہذیبی ٹکراؤ سے جنم لے رہا ہے۔ سو ہمارے عہد نے شاعر، ادیب اور دانشور کے ذہن کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہی نو جدلیاتی فلسفہ ہے محبت کا جو نفرت کے تضاد کے طور پر جنم لے رہا ہے اور جو ضمانت بن کر سامنے آ رہا ہے۔ انسانی بقا اور امن عالم کی۔ لیکن شاعر کا، ادیب کا، دانشور کا ذہن الجھا ہوا ہے شاعر جو زندگی کی اور زندگی میں موجود حسن، خیر اور محبت کی بقا چاہتا ہے اس کا احیا چاہتا ہے، شاعر جو ماجد یزدانی کے پہراوے میں دنیا کے خوبصورت سے خوبصورت ترین رنگ کا خواہش مند ہے لیکن انور سدید کے خیال میں ''ماجد یزدانی'' کا زمانہ قدروں کی شکستگی کا زمانہ ہے چنانچہ ان کی شاعری میں کہیں کہیں داخلی کرب سر ابھارتا ہے جو اس زمانے کی عطا ہے لیکن وہ اس کرب سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ اسے زندگی کی حقیقت سمجھ کر نہ صرف خود قبول کر لیتے ہیں بلکہ لالہ وگل کو اپنا بھی ''رنگ قبا یاد کرنے کا مشورہ دیتے

زاہد حسن

ہیں۔ جو بلاشبہ خوں رنگ ہے اور مجھے شاید یہ کہنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ، کوئی تردد نہیں ہوگا کہ نہ صرف لالہ گل کا رنگ قبا خون رنگ ہے آج تو عالم کل خون رنگ ہے۔ اس کا فسانہ اس کی حقیقت سبھی کچھ خوں رنگ ہے۔ اس خوں رنگ تہذیب کا نوحہ ہی آج کے شاعر کی حقیقی میراث ہے اور یہ میراث ہے انسانی رشتوں، ناتوں، محبتوں اور حسن کی حقیقتوں کا بیان، ان کا فروغ اور یہ سارا کچھ کہیں ماضی میں، ماضی کے خواب گوں دریچوں میں سب جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ خیال، اب ملال کی کیفیت اختیار کر چکا ہے اور ماجد یزدانی اسے یوں بیان کرتے ہیں:

تجھ سے جدا ہوئے تو مجھے عمر ہو چکی
لیکن تیرا خیال، میرے ساتھ ساتھ ہے
ہر یاد دل سے وقت کی لہریں مٹا گئیں
لیکن وہ اک ملال، میرے ساتھ ساتھ ہے

.....

اور پھر یہ رنج، یہ محن، یہ غم، یہ حزن اس کی ذات، اس کے داخل کے دائرے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ ہمارے عہد کے سیاسی بزرجمہروں، رہنماؤں اور سیاست دانوں نے تو دنیا کو بارود کے ڈھیر پر لا کر لا دیا ہے ایسے میں محبت کے موسموں کی یاد ہی اس کیلئے غنیمت ہے وہ کہ جب اس نے بھی زمانے کے رنگ ڈھنگ اپنا لیے تو ماجد نے کہا:

عشق ہے جھوٹ، حسن دھوکہ ہے
ہم سے بڑھ کر یہ کس نے جانا ہے

.....

اور وہ جس کے بغیر یہ احساس بھی روشن اور تاباں ہے:

یوں تو دیکھے بہت حسین ہم نے
ہاں مگر اس کی بات ہی کیا ہے

.....

رائیگانی کا یہ احساس، بے ثمر دنوں اور بے خواب راتوں کے رنگ لیے آنکھوں میں آن بستا ہے۔ تبھی ماجد یزدانی کو یہ کہنا پڑتا ہے:

بچھڑ جاتے ہیں جو ہم سے وہ پیارے کیوں نہ ملتے
کہ مل جائیں اگر دل تو ستارے کیوں نہیں ملتے

.....

یہ ہمارے عہد کے اس بے ثمر دنوں اور بے خواب راتوں کے حامل شاعر کی سوچ ہے جو رنجوں اور کلفتوں کے ادبار میں پڑی سسک رہی ہے، تڑپ رہی ہے۔ ماجد یزدانی کا تعلق ایک ایسے خانوادہ سے ہے، جسے علم کی شمعیں جلائے پوری صدی ہونے کو آئی ہے۔ یزدانی جالندھری ایک صاحب، اسلوب شاعر، منفرد نثر نگار، مترجم اور اعلیٰ پائے کے مدیر تھے۔ ماجد یزدانی کو جملہ صفات ایسی ہی برگزیدہ ہستی سے ورثے میں ودیعت ہوئی ہیں، خیالات کی

تابانی، لفظ کی حرمت اور زبان کا سلیقہ سب کچھ اس نے اپنے والد محترم سے پایا ہے لیکن اس کے شعروں میں واردات، واردات کے پیچھے کارفرما دکھ اس کے، اس کی ذات کے ہیں، اپنے انہی دکھوں سمیوہ اپنے شعری منظر نامہ کے سبھی رنگ کشید کرتا ہے۔ شعروں کے رنگ بھی اور نظموں کے مصرعوں کے رنگ بھی اور پھر جس طرح اس کا دکھ ذاتی ہے، اس کی یاد اور یادوں میں آباد لوگوں کا بھی اس کی ذات کے ساتھ گہرا سمبندھ نظر آتا ہے۔ سووہ کہتا ہے:

ذہن میں اب بھی تری یاد کے جگنو چمکیں
اور سانسوں سے ترے قرب کی خوشبو آئے

.....

صرف یہی نہیں، صرف اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نے تو ہمارے جملہ سیاسی، سماجی منظر نامے کو اپنی شاعری کا جزو لاینفک بنا دیا ہے:

صبح بچوں کو تسلی دے کے نکلا تھا جو شخص
دن اکارت ہو گیا تو گھر کے باہر سو گیا

.....

اور اب آخر پہ اس کی ایک نظم کا حوالہ دیا جانا ضروری ہے۔ نظم "یہ جو اشک ہیں مری آنکھ میں" اپنے موضوع اسلوب اور لفظیات کے اعتبار سے جدید اردو نظم کی انتہائی خوبصورت ترین شکل ہے۔ نظم کے اندر ظاہرا تو تنہا ماجد یزدانی کی ذات کا کرب نمایاں ہوتا محسوس ہوتا ہے لیکن اپنے خارج میں اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور اس کی اس معنوی، فکری اور موضوعاتی سمت میں شاعر کی عقل رسا کو بہت زیادہ عمل دخل حاصل ہے۔ میرے خیال میں یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے:

سر شام میری نگاہ میں
جو چمک رہے ہیں چراغ سے
یہ عذاب ہیں کسی ہجر کے
وہ جو ساتھ ہے مرے، عمر سے
اسی آگ میں ہوں میں اب تلک
جو ترے فراق کی دین ہے
وہ جو دل تھا جس میں کہ آس تھی
ترے پیار کی تری چاہ کی
وہ سلگ چکا اسی آگ میں
یہ جو اشک ہیں مری آنکھ میں
یہ اس کی یاد کے پھول ہیں

.....

ماجد یزدانی نے اپنی شاعری کا خمیر جس آگ، جس آنکھ، آنکھ کے جن سلگتے اشکوں اور یادوں، یادوں کے پھولوں سے اٹھایا ہے وہ نہ صرف پائیدار رنگوں کے رمزیئے ہیں بلکہ یہ شاعری کا وہ استعاراتی نظام بھی ہیں جو شاعر کو ایک وقار، ایک اعتبار بھی بخشتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جاذبِ نظر شکیل اور نمی دانم

شکیل جاذب اگر شاعر نہ ہوتا تو کسی فلم کا ہیرو ہوتا۔ اس کا دراز قد، پُر بہار چہرہ، لہجے کا دھیما پن اور کھلتی ہوئی گہری مسکراہٹ پر جانے کتنی پریاں فدا ہوتیں مگر اس نے کبھی اپنی فنکارانہ خوبیوں پر توجہ نہ دی اور شاعر بن گیا۔ اور شاعر بھی ایسا کہ اس کے اشعار بھی اس کی شخصیت کی طرح بھرپور دلکشی لیے ہوئے۔ پڑھنے اور سننے والے کو اپنے سحر میں لیے کسی رومان بھری وادی میں چھوڑ آئیں:

تغافل بھی برتنا دھڑکنیں ہمراز بھی کرنا
کسی کا ہو کے بھی رہنا، نظر انداز بھی کرنا
نگاہیں پھیرنا اور دیکھنا چشمِ تصور سے
مقفل کر کے دروازہ، دریچہ باز بھی کرنا
کسی کے روبرو ایسا کہاں آسان ہوتا ہے
خموشی کا بھرم رکھنا، سخن آغاز بھی کرنا

.....

غزل شروع ہوتی ہے تو کسی پہاڑی جھرنے کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ نمونے کا شعر لکھتے ہوئے قلم کا روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ادق سے ادق مضمون بھی جب اس کے قلم سے گزرتا ہے تو پانی ہو جاتا ہے۔ وہ انتہائی میٹھے لہجے میں بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے اور اس کا یہی سلیقہ اور قرینہ اس کی شعر گوئی میں بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اپنے لہجے کی طرح وہ اپنے رویے میں بھی تہذیب کی خوشبو ساتھ لے کر چلتا ہے:

پھر تجھے اور مجھے اور کہیں جانا ہے
ہمسفر ساتھ تو چل جتنی سڑک باقی ہے

.....

شکیل جاذب سے میری پہلی ملاقات پی ٹی وی کے ایک مشاعرے کے دوران ہوئی۔ میں ان دنوں پی ٹی وی ہوم اسلام آباد میں سکرپٹس ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پی ٹی وی پالیسی کے مطابق شعرائے کرام کا کلام دیکھتے ہوئے جب شکیل جاذب کا کلام دیکھا تو اس کے کلام کی ندرت نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے کلام میں

ارشد چہال

اخلاص کی وہ روشنی تھی جو شعر کہنے والے کے نازک احساس کی عکاسی کرتی ہے۔ مجھے شکیل جاذب بھی اچھا لگا، اس کا کلام بھی، اس کے لہجے کا ٹھہراؤ بھی اور رچاؤ بھی۔ یہاں تک کہ میں نے پروڈیوسر سے کہہ دیا کہ وہ میزبانی کے فرائض بھی شکیل جاذب کو ہی سونپ دے۔ ہمارا تجربہ کامیاب رہا اور شکیل جاذب نے اپنے حسنِ بیان سے مشاعرے کو چار چاند لگا دیئے اور شکیل جاذب نہ صرف مشاعرے کا بلکہ دیگر پروگراموں کا بھی میزبان بن گیا۔ جن میں ٹاک شوز اور موسیقی کے پروگرام بھی شامل تھے۔

رفتہ رفتہ شکیل جاذب سے دوستی ہو گئی۔ شکیل جاذب ایک معروف شاعر اور کمپیئر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر بھی فائز ہے، اس کے فرائض منصبی کے حوالے سے اس پر بعض اہم اور بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مگر جب بھی اُسے کسی مشاعرے یا کسی دوسرے پروگرام کی میزبانی کے لیے بلایا گیا تو اس نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ وقت نکال کر میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ قدرت نے اسے ہر موضوع پر بولنے کا ملکہ ودیعت کر رکھا ہے لہٰذا پروگرام ادبی ہو، مذہبی ہو، سائنسی ہو یا معاشی شکیل جاذب اس کی میزبانی کو نبھانے کا فن اچھی طرح جانتا ہے، کبھی کسی پروڈیوسر کا مایوس نہیں کرتا۔

شکیل جاذب پچھلی کئی دہائیوں سے شعر کہہ رہا ہے مگر اسے پڑھنے اور سننے کا مجھے بہت کم موقع ملا ہے بس وہی کلام جو اس نے مشاعرے میں پڑھنا ہوتا تھا وہی مجھے دیکھنے اور سننے کا موقع ملتا۔ وہ ایسا شاعر بھی نہیں ہے جو دوسروں کو اپنا کلام سنانے کا شوق ہو، اس کی پہلی کتاب ''جب سانس میں گرہیں پڑتی ہیں'' مجھ تک نہ پہنچ سکی سو اسے پڑھنے کا موقع بھی نہ ملا۔ جب افتخار عارف اور عصرِ حاضر کے دیگر شاعر شکیل جاذب کی شاعری کی تعریف کرتے تو اسے پڑھنے کا اشتیاق اور بڑھنے لگتا۔ حال ہی میں شکیل جاذب کی دوسری کتاب 'نمی دانم' منظرِ عام پر آئی ہے اور اس کی ایک کاپی مجھے بھی ملی ہے۔ میں شکیل جاذب کو پڑھنا چاہتا تھا، سو پہلی فرصت میں مطالعہ شروع کر دیا۔ ''نمی دانم'' میں نعتیں، منقبت، سلام، مدح، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ شکیل جاذب نے تمام اصنافِ سخن میں اپنی محبت، عقیدت اور شعریت کے جوہر دکھائے ہیں۔ شکیل جاذب نے اپنی دلکش اور عمدہ سخن وری سے ''نمی دانم'' میں ایک چمن کھلا دیا ہے۔

شکیل جاذب کا فکری نظام اور جمالیاتی رچاؤ، خیال کو ایسے قرینے سے شعر میں ڈھالتا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے اس کی لفظی اشکال اور تراکیب و توازن کا حسن یا حسنِ فطرت کے انداز میں وجود پاتا ہے۔ اس کے مزاج کا ٹھہراؤ اور اس کے وجدان کی گہرائی زندگی کے آئینے میں ایک ایسے عکس کا اضافہ کرتی ہے جو نیا ہونے کے باوجود بہت مانوس اور دل کے قریب محسوس ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے تصور میں بننے والی تصویر کسی ابہام کے بغیر واضح طور پر دکھائی دینے لگتی ہے:

جاذب چراغِ عشق سے روشن ہے کائنات
اس روشنی میں کچھ بھی چھپا دیکھتے نہیں

.....

ایک شاعر کی حیثیت سے شکیل جاذب محض ہجر کا رونا ہی نہیں روتا وہ اپنے محبوب کے حسن کی تصویر کشی کائنات کے فریم میں رکھ کر ایک ایسے زاویے سے کرتا ہے کہ اس کے محبوب کا حسن آفاقی روپ دھار لیتا ہے:

یہ جو اب لگتا ہے رنگِ آسماں دیکھا ہوا
آپ کی آنکھوں سے پہلے تھا کہاں دیکھا ہوا

.....

اردو کی کلاسیکل شاعری پر نظر ڈالیں تو غزل کے اشعار کے موضوعات کسی حد تک محدود رہے ہیں۔ زندگی کو ایک باغ کی صورت دکھایا گیا ہے جس میں کبھی بہار آتی ہے اور کبھی خزاں اور اس کے لیے باغ کے ہی سارے استعارے برتے گئے ہیں۔ پھر ایک خیالی محبوب جو انتہائی خوبصورت مگر خودسر، نامہربان اور بے وفا، ہر عاشق کو اس کے ہاتھوں قتل ہونے اور ستم سہنے کی تمنا۔ تیسرا بڑا موضوع میخانہ اور رندانہ اندازِ فکر، میخانے کی فضا کو شعری استعاروں میں ڈھالا گیا چوتھا شیخ اور واعظ کے نظریات سے روگردانی پانچواں محبوب کی سراپا نگاری زلف و رخسار قد و قامت پر طبع آزمائی اور چھٹا کلاسیک شاعری کا پسندیدہ ترین موضوع یاسیت رونا دھونا کبھی محبوب کی بے وفائی کا کبھی ہجر کا کبھی گردشِ حالات کا جس میں شاعر کے دل کا اضطراب اشکوں، نالوں اور آہوں سے اظہار پاتا ہے۔ یہ موضوعات جدید غزل میں بھی موجود ہیں کیونکہ یہ ایک مضبوط روایت کا حصہ بن چکے ہیں ہر شاعر شعری مطالعے اور خیال کی ترکیب، میں یہ روایت ایک انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان موضوعات سے بچ نکلنا کسی بھی شاعر کے لیے آسان نہیں ہوتا لیکن عہدِ حاضر کے کچھ شعرا نے اس روایت میں رہتے ہوئے ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے ان شعرا میں شکیل جاذب بھی شامل ہیں۔

شکیل جاذب محبت کو زندگی کا جواز بناتا

ہے۔ محبت کے علاوہ وہ ہر ایک خواہش کو محض کھیل تماشا اور کھلونے خیال کرتا ہے:

وہ تو میں بس پیار کر بیٹھا کسی سے اے خدا
ورنہ تیرے ان کھلونوں سے بہلتا کون تھا

.....

گویا محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو جاودانی ہے دیگر سب فانی ہے۔ شکیل جاذب کا دل محبت کے احساس میں لپٹا ہوا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سوائے محبت کی آرزو کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا:

جز نہالِ آرزو سینے میں کیا رکھتا ہوں میں
کوئی بھی موسم ہو یہ پودا ہرا رکھتا ہوں میں

.....

محبت کی آرزو کو ہر موسم میں شگفتہ رکھنے کی آرزو، دراصل ایک ایسے انسان کی روحانی تربیت کی رغبت رکھتی ہے جو زندگی اور فطرت کے ماحول میں کسی تخریب کا باعث نہیں بنتی۔ شکیل جاذب اس فطری محبت کی تجسیم اور تفہیم چاہتا ہے مگر زندگی کے تقاضے اور اسکی مصروفیات اس جذبے کی نقش گری کا وقت ہی نہیں دیتیں۔ وہ زندگی کی بے مصرف مصروفیات کی چنگل سے نکل کر اپنی دنیا میں محبت کے جذبوں کو استوار کرنا چاہتا ہے۔ جب اسے ایسا کرنے کی فرصت نہیں ملتی تو اس کی یہ آرزو ایک دکھ کے پیکر میں ڈھل کر اس کی پلکوں پر کسی آنسو کی طرح چمکنے لگتی ہے:

ہم سے اک نقش کی تفہیم بھی جاذب نہ ہوئی
دستکیں دیتے رہے آنکھ پہ منظر کیا کیا

.....

وہ اس محبت کے جذبے کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جب وہ اس جذبے کے سحر سے نکل کر کار دنیا میں مصروف ہوتا ہے تو بہت جلدی اوب جاتا ہے، تھک جاتا ہے گھبرانے لگتا ہے۔ وہ سانس لینے کے لیے پھر اسی جذبے کی محبوب صورت دیکھنے کی تمنا کرتا ہے تا کہ وہ اپنے احساس کی سانس بحال کر سکے:

تو نہ دیکھے تو عجب حبس میں دم گھٹتا ہے
تیرے دیکھے سے میں برسات میں آجاتا ہوں

.....

شکیل جاذب کی مصروفیات میں اور بھی بہت کچھ ہے یاد رکھنے کو جسے وہ اپنی ڈائری میں یا موبائل میں نوٹ بک میں لکھ کر رکھتا ہے کہ نئے دن کی مسافت میں اسے کس کس مرحلے سے گزرنا ہے۔ وہ دن میں بے شمار لوگوں سے ملتا ہے ان سے مالی معاملات پر طویل بحثیں کرتا ہے مگر شام کو جب وہ گھر لوٹ رہا ہوتا ہے تو وہ دن کے بکھیڑوں کو بھول چکا ہوتا ہے اور وہ اسی ایک لمحے کو اپنے دل کی شاخ پر کسی تازہ

گلاب کی طرح کھلتا ہوا دیکھتا ہے جس میں کسی کے لمس کی خوشبو گلاب کی پتیوں پر شبنم کی طرح چمک رہی ہوتی ہے:

لپٹا ہوا ہے جسم سے اک لمس مستقل
کہنے کو آپ مجھ سے فقط لمحہ بھر ملے

.....

جہاں تک شکیل جاذب کی سخن وری کے ہنر کا تعلق ہے اسے اپنے خیالات اور الفاظ پر پوری طرح دسترس ہے۔ وہ ہزاروں بار کہے ہوئے مضمون کو بھی جب شعر کی صورت میں ڈھالتا ہے تو اُسے ایک ایسے نئے پہلو اور زاویے کے ساتھ کہتا ہے کہ آئینے میں اس کا عکس بالکل نیا دکھائی دینے لگتا ہے۔ کربلا کی پیاس پر لاکھوں شعر کہے جا چکے ہیں مگر شکیل نے اس مضمون میں بھی ایک ایسی ندرت پیدا کر دی ہے ایک ایسا استعارہ بنا دیا ہے جو اس پیاس کو ایک نیا آہنگ فراہم کر دیتا ہے۔ ایک نئے دکھ سے آشنا کرتا ہے:

اک جوئے اشک رواں ہے کہ جو تھمتی ہی نہیں
جانے کن پیاسوں نے دعا مانگی تھی پانی کی

.....

اسی طرح مرزا غالب کی زمین میں شعر کہنا ''اسد اللہ خاں قیامت ہے'' میں نے جب بھی غالب کی زمین میں کسی شاعر کی غزل پڑھی ہے تو دل نے یہی کہا کہ بات بنی نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غالب کی زمین میں غزل کہنے والے غالب کے مضامین اور لہجے کو بھی غزل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں۔ شکیل جاذب نے غالب کی زمین میں غزل کہتے ہوئے غالب کی زمین میں فضل اپنے مضامین اور لہجے کی بوئی ہے:

دن رات چہچہاتے ہیں دل کی منڈیر پر
یادوں کے پنچھیوں کو بھی کوئی شجر ملے
تم تک تو خیر مجھ کو پہنچ پانا تھا کہاں
اس جستجو میں کچھ نئے رستے مگر ملے

.....

غزل پڑھتے ہوئے ذرا بھی دھیان غالب کی طرف نہیں جاتا یہی شکیل جاذب کی عمدہ ہنرکاری ہے کہ وہ بنے بنائے رستے پر بھی اپنے انداز اور اپنی رفتار کے ساتھ چلتا ہے۔ شکیل جاذب نے ابھی تک کے شعری سفر میں جو کمالات دکھائے ہیں وہ اس کی فکری عمارت کا ڈھانچہ مضبوطی سے قائم کر چکے ہیں۔ دنیائے شعر و سخن میں اس کے مقام کا تعین ہو چکا ہے مگر اس کے سخن کا سفر ابھی باقی ہے۔ ابھی اسے شعر کی مزید بلندیوں تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ نئی منزلوں کی طرف قدم بڑھانا ہے:

اس قید بام و در سے نکل جانا چاہیے
وحشت کو گھر نہیں کوئی ویرانہ چاہیے

☆☆☆☆☆

معتبر شاعرہ منصورہ احمد کی متنازعہ شخصیت [بقیہ حصہ]

ولادت۔یکم جون 1958 حافظ آباد ------وفات۔8.جون 2011 لاہور

سنو

سنو
جن کی ہنسی سے اس زمیں پر پھول کھلتے ہوں
جنھیں نغمے پہ اتنی دسترس ہو
کہ پنچھی ان کی لے پر چہچہاتے ہوں
انہیں تو اس طرح چپ چاپ ہو جانا نہیں سجتا
سنو
ساری زمیں گمبھیر چپ اوڑھے ہوئے
ساکت کھڑی ہے
تم اتنا ہی کرو اک بار ہنس دو
زمیں کی منجمد سانسوں میں
پھر سے زندگی چلنے لگے گی
پہلے دن سے لوہے کے جوتے پہناؤ
یہی ہوا اور ہوتا آیا
سب نے دیکھا
سرخ سجیلے چہروں والی
اور گدرائے جسموں والی دوشیزائیں
آنگن کی دیوار پکڑ کر چل پاتی تھیں
سوچ رہی ہوں
صدیاں کیسے اتنا پیچھے لوٹ آئی ہیں
چین کی سرحد کیسے میرے گھر آنگن تک آ پہنچی ہے
لوہے کے جوتوں میں جکڑے میرے پاؤں
آنگن کی دہلیز الانگ کے
اپنی دنیا تک جانے سے انکاری ہیں

''یہاں سے آسماں دیکھو'' جو کہ بلاشبہ ایک انوکھے خیال کی عکاسی کرتی ہے اور اس میں

ظفر معین بلے جعفری

منصورہ احمد نے دھول، پلکیں، صحرا، کلیاں، شاخوں، شاخوں پہ ہلکا بور، پت جھڑ، چاند، سمندر، روز و شب، ساحل، جزیرہ، زندگی، بدن، گھاٹیاں، آنکھ، خوشبو، خلا، گرداب، بیل، آنگن، آسمان اور زمین جیسے مظاہر قدرت و فطرت کے ذکر سے ثابت کیا ہے کہ فطرت اور قدرت کی ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر قائم یہ کائنات اور اس کائنات کا ہر رنگ اور روپ انہیں کس قدر عزیز ہے۔

ادب کے ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے میرا اکابرین و ناقدینِ ادب اور اکادمی ادبیات جیسے اداروں کے کرتا دھرتا جو بھی ہیں ان سے سوال یہ ہے کہ منصورہ احمد کا ایک مجموعہ کلام منظر عام پر آچکا اور اس منصورہ احمد کا اب تک جتنا بھی کلام منظر عام پر آچکا ہے اس پر اہلِ نظر اور نقادانِ فن اپنی آرا دے چکے ہیں اور اگر ان تمام تر آرا کو یکجا کیا جائے تو دو یا تین ضخیم کتابیں مرتب کرنا تو ہرگز بھی دشوار نہیں تو منصورہ احمد کا شعری 8 جون 2011 کو اس کی سانسوں کے ساتھ ختم کیسے ہوسکتا ہے۔ جبکہ منصورہ احمد اپنی زندگی میں ہی اپنا دوسرا شعری مجموعہ پبلش نہ بھی کرواسکی تو کم از کم مرتب ضرور کر چکی تھی۔

منصورہ احمد..... کی 53 سالہ زندگی پر ایک نظر

نام: منصورہ احمد

والد کا نام: مرزا حبیب احمد

تاریخ ولادت۔ یکم جون 1958

مقام ولادت: حافظ آباد

تعلیم۔ ایم اے انگلش 1982

وجہ شہرت: احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی شاعرہ مدیرہ پبلشر اور مصنفہ

بانی میجنگ ڈائریکٹر

اساطیر۔ پبلشرز/ پبلی کیشنز۔ لاہور

مدیر منتظم/ شریک مدیرہ :۔ سہ ماہی فنون لاہور _ 1986 2006

مدیرہ : ۔ سہ ماہی مونتاج لاہور 2006_2011

پہلا مجموعہ کلام۔ طلوع 1997

(وزیر اعظم انعام یافتہ 1998 مجموعہ)

دوسرا مجموعہ کلام

آسمان میرا ہے (مرتبہ 2010) (تا حال غیر مطبوعہ)

منصورہ احمد کی زندگی کے آخری تین چار برس شدید علالت میں گزرے اور پھر

وفات :۔ 8. جون 2011 لاہور

پہنچی وہیں پہ خاکِ جہاں کا خمیر تھا

لاہور میں منصورہ احمد کے سانسوں کی گنتی پوری ہونے کے بعد انہیں ان کے آباؤ اجداد کے شہر حافظ آباد میں ہی سپرد خاک کر دیا۔

جب میں نے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی سالگرہ کے حوالے تہنیتی کارڈز پرنٹ

کروانے کے سلسلے کا آغاز کیا تو یہ احمد ندیم قاسمی صاحب کی اکہترویں سالگرہ کا موقع تھا۔ میری دانست میں لاہور کے دو تین ہی پرنٹرز بہت معیاری کام کرنے والے تھے۔ ایک ٹریک اینڈ ٹائی اور دوسرے الائیڈ پریس لہٰذا ابتدا میں پانچ ہزار کارڈز پرنٹ کروائے۔ نومبر کی یکم تاریخ تھی۔ ترسیل سے قبل خفیہ بھی رکھنا تھا خاص طور احمد ندیم قاسمی صاحب سے۔ اب مرحلہ آیا بذریعہ ڈاک ارسال کرنے کا تو ہم احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہماری والدہ ماجدہ مہر افروز بلے صاحبہ کو منصورہ باجی سے کچھ کام ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم تھوڑی دیر کے لیے منصورہ باجی کو ساتھ لے جا کر ملوا لاتے ہیں۔ ابھی تک منصورہ باجی کو کسی بات کا علم نہیں تھا یہ سب سن کر ندیم قاسمی صاحب سے زیادہ تعجب تو منصورہ احمد کو ہو رہا تھا۔ کہنے لگیں بابا میں ان سے فون پر رابطہ کر لیتی ہوں پوچھ لیتی ہوں کیا کام ہے۔ یہ سن کر تو ہمیں ہمارا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آنے لگا اور یہ بھی ڈر لگا کہ اگر انھوں فون کر دیا تو پول کھل جائے۔ یا اللہ مدد فرما۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ نہیں یہ نامناسب بات ہوگی بیٹی آپ کا ہم عمر ہو تو ٹھیک لیکن اپنے سے بڑوں کی تعظیم لازمی ہے اور محترمہ مہر افروز بلے صاحبہ سے تو آپ پہلے بھی متعدد بار ملاقات کر چکی ہیں اور انھوں نے آپ کو لینے کے لیے بھجوایا ہے لہٰذا آپ کا جانا زیادہ بہتر رہے گا۔ منصورہ احمد ہمارے ساتھ مجلس کے دفتر سے شادمان جی۔او۔آر۔ تھری کے لیے روانہ ہو ہی رہیں تھیں جیسے ہی ہم لوگ گاڑی میں بیٹھے تو روانگی سے قبل میں نے منصورہ احمد صاحبہ تہنیتی کارڈز میں سے ایک نکال کر دکھایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑیں۔ میں نے عرض کیا آپ کے پاس جو "فون" کی میلنگ لسٹ ہے وہ بھی درکار ہوگی۔ انھوں نے کہا جی جی بالکل رکیے میں ابھی لیکر آتی ہوں آج ہی فوٹو کاپیاں کروا کر رکھی ہیں۔ خیر وہ بھاگم بھاگ فوٹو کاپیاں اٹھا لانے میں کامیاب رہیں۔ ہم شادمان میں بلے ہاؤس پہنچے۔ ہماری والدہ منصورہ احمد سے ملیں۔ پھر ہم دونوں ڈسپیچ کا کام پھیلا کر بیٹھ گئے۔ تین چار گھنٹے لگے لیکن کام مکمل نہ ہوا۔ پھر منصورہ احمد نے کہا اب مجھے ڈراپ کروا دیں بابا پریشان ہو رہے ہونگے۔ باقی کام ہم دونوں کل دوبارہ مل بیٹھیں گے تو کر لیں گے۔ خیر ہم انھیں مجلس کے دفتر ڈراپ کرنے گئے تو قاسمی صاحب فکر مند بیٹھے تھے۔ ہمارے پہنچنے پر بس اتنا پوچھا کہ سب خیریت تو ہے۔ ہم نے ان کی تسلی کروا دی۔ اگلے روز منصورہ احمد کام مکمل کرنے کے لیے پہنچیں۔ اور ہم نے پھر تین چار گھنٹے بیٹھ کر کام مکمل کیا۔ منصورہ احمد صاحبہ سے مشاورت کی اور پھر طے یہ پایا کہ لوکل کارڈز 20 نومبر

سے تین یا چار روز قبل پوسٹ کیے جائیں جبکہ بیرون ملک کم از کم بارہ پندرہ روز قبل سپرد ڈاک کیے جائیں۔ منصورہ احمد صاحبہ کے ساتھ مل کر میلنگ لسٹ کے مطابق ہم نے سب سے پہلے انڈیا۔ یو کے۔ کینیڈا اور امریکہ کے کارڈز پوسٹ کیے اور شرارتاً ہم نے ایک کارڈ احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھی پوسٹ کیا۔ کارڈ موصول ہونے پر ان کا فون آیا اور انھوں نے فرمایا کہ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ سازش ہو رہی ہے کسی قسم کی۔ جب مجلس کے دفتر میں مَیں اور منصورہ احمد اور احمد ندیم قاسمی صاحب بیٹھے ہوئے تھے تو اختر حسین جعفری صاحب تشریف لے آئے تو قاسمی صاحب نے ان سے کہا کہ میرے اور آپ کے علاوہ اس کمرے میں جو موجود ہیں وہ سازشی عناصر ہیں۔ سازشی ٹولے کی کارگزاری ملاحظہ کیجیے یہ کہہ کر قاسمی صاحب نے تہنیتی کارڈ ان کی جانب بڑھایا تو اختر حسین جعفری نے فرمایا جی جی مجھے بھی موصول ہوا اور دیکھ کر بے حد خوشی کا احساس ہوا۔ اس اقدام کو سراہا جانا چاہیے کیونکہ یہ ادبی دنیا میں ایک عمدہ اور خوبصورت روش کا آغاز ہے۔ خلاف توقع سب سے پہلے بھارت میں گلزار صاحب کو کارڈ موصول ہوا اور انھوں نے کارڈ موصول ہوتے ہی احمد ندیم قاسمی صاحب کو فون کیا اور سالگرہ کی پیشگی مبارکباد دینے کے بعد ہمارا نام لے کر ہم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور ہمارے فون کا نمبر بھی قاسمی صاحب سے یہ کہہ کر لے لیا کہ ہم خود ظفر معین بلے صاحب کو فون کریں گے اور ان کی قائم کردہ اس نئی روایت کو جاری رکھنے کی بھی فرمائش کریں گے۔ ہمیں یاد ہے کہ قاسمی صاحب نے ہمیں فون کر کے مجلس کے دفتر بلوایا اور کہا کہ دو گھنٹے بعد گلزار صاحب کا دوبارہ فون آئے گا۔ ہم بروقت پہنچ گئے اور منصورہ احمد - احمد ندیم قاسمی صاحب اور برادرم خالد احمد صاحب کی موجودگی میں ہماری جناب گلزار صاحب سے تفصیلی بات ہوئی۔ انھوں نے ہمارے اس اقدام کو بے حد سراہا اور اس سلسلے کو ہر سال جاری رکھنے کی فرمائش بھی کی۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی سالگرہ کی مناسبت سے ہمارے پرنٹ کروائے ہوئے گریٹنگ کارڈز کو ہر سال ہی بے حد سراہا جاتا تھا۔ مہر سلطانہ صاحبہ نے تو احمد ندیم قاسمی صاحب کے جشنِ ولادت کی مناسبت سے ہمارے پرنٹ کروائے ہوئے کارڈ جناب محترم شبنم رومانی صاحب سے حاصل کیا اور اس کا عکس اپنی کتاب میں شائع فرمایا۔

اب سے دو برس قبل ہم نے منصورہ احمد کی شاعری کے حوالے سے ان کی برسی کے موقع پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تو ایک بطور شاعرہ جانی پہچانی جانے والی شخصیت نے ہمیں فون کر کے پوچھا کہ ''آپ نے

منصورہ احمد کی شاعری پر ایک توصیفی مضمون کیوں لکھا۔ آپ نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ ناہید قاسمی صاحبہ کو ناگوار گزرے گا بلکہ انہیں ذہنی اذیت پہنچے گی آپ نے یہ مضمون لکھ کر کم ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے مجھے بہت کوفت اٹھانا پڑی بہت بُرا لگا۔ لگتا ہے اب تک میرا شعری مجموعہ آپ کی نظر سے نہیں گزرا اگر گزرا ہوتا تو منصورہ کے مجموعہ کلام کے بجائے میری شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تو مجھے بہت اچھا لگتا"

جب محترمہ نے اپنی بات مکمل کر لی تو ہم نے بصد احترام ان سے عرض کیا کہ ہم نے آپ کی اعلیٰ ظرفی دیکھ رکھی ہے آپ کو تو نہ ہی بڑوں کی بزرگی کا خیال ہے نہ ہی کسی کے بھی سفید بالوں کی لاج ہے۔ ہم نے سب سن رکھا ہے احمد ندیم قاسمی صاحب سے اور اشفاق احمد خاں صاحب سے۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب سے اور لطیف الزماں صاحب سے اور دیگر اصحاب باکمال سے۔ آپ نے جس طرح ان کی پگڑیاں اچھالیں اس پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور رہی بات ڈاکٹر ناہید قاسمی صاحبہ کی تو ہم انہیں آپ سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی صاحبہ ایک مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ، ایک زیرک، اعلیٰ ظرف اور بردبار خاتون ہیں ہم دل سے ان کی اور ان کی علمیت کی قدر کرتے ہیں۔ ہم خوب سمجھ سکتے ہیں کہ کسی کے حوالے سے خاص طور پر منصورہ احمد کے حوالے سے کچھ لکھنے پر ان کو ذہنی کوفت ہوگی یا نہیں لیکن جو کچھ آپ حضرت احمد ندیم قاسمی صاحب کے حوالے سے فرما چکی ہیں اس سے یقیناً "تمام محبان احمد ندیم قاسمی کو بہت تکلیف پہنچی اور انھیں ذہنی اذیت بھی ہوئی لیکن اس سے ایک مثبت نتیجہ اخذ ہو گیا اور وہ یہ کہ آپ کا ظرف سب پر کھل گیا۔ آپ نے احمد ندیم قاسمی صاحب، عاصی کرنالی صاحب اور اشفاق احمد خاں صاحب ہی کیا بانو قدسیہ آپا کو بھی نہ چھوڑا اور آخر میں ایک اہم بات اور وہ یہ کہ ہمیں اپنے بڑوں اور بزرگوں اور اسلاف سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے اور وہ سب کے سب ہمیں ہم سے زیادہ جانتے پہچانتے اور سمجھتے ہیں اور ہم نظریاتی اختلاف کی بات سنتے بھی ہیں اور اس پر غور بھی کرتے ہیں لیکن اگر بات ذاتیات پر حملوں تک پہنچے گی تو اس کو کسی طور درگزر یا معاف کرنے کو تیار نہیں۔ امید ہے کہ آپ ہمیں کبھی کسی قسم کا سبق پڑھانے کی کوشش نہیں کریں گی۔ اللہ حافظ۔

منصورہ احمد نے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ 1986 سے 2006 تک حضرت احمد ندیم قاسمی کا جاری کردہ مقبول ترین ادبی جریدوں

اور رسالوں سے ایک ادبی رسالے ''فنون'' کے ادارتی بورڈ میں شامل رہیں۔ جبکہ منصورہ احمد کا نام بطور شریک مدیرہ دس برس سے کم عرصہ چھپا لیکن عملی طور پر منصورہ احمد کی بھرپور معاونت شامل حال رہتی۔

اختر حسین جعفری کی شعری تخلیقات ویسے تو بلا شبہ 90 فیصد انتہائی تواتر اور اہتمام کے ساتھ ''فنون'' میں شائع ہوا کرتی تھیں یا پھر یہ اعزاز سید فخر الدین بلے اور راقم السطور ظفر معین بلے کے زیر ادارت شائع ہونیوالے جریدے ''آواز جرس'' کو حاصل ہوا۔ ''فنون'' کے مدیر احمد ندیم قاسمی اور معاون مدیرہ منصورہ احمد نے قبلہ اختر حسین جعفری کی رحلت کے بعد شاندار و جاندار ''فنون'' کا اختر حسین جعفری نمبر بھی شائع کیا تھا۔

ہمارے پیارے اور محترم جناب اختر حسین جعفری صاحب کی والد گرامی قبلہ سید فخر الدین بلے سے محبت اور تعلق داری اور رفاقت کی داستان اللہ جانے کتنی عمر رسیدہ ہوگی ہم تو کم از کم اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد سے دیکھتے چلے آئے ہیں اور بیشک ہمیں اختر حسین جعفری انکل کی محبت و چاہت وراثت میں ملی ہے۔ ہمیں جناب منظر حسین اختر بھائی صاحب اور برادر عزیز جناب امیر حسین جعفری کا شعر خوبصورت شعرا میں ہوتا ہے اور وہ ہمیں بہت عزیز ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے اختر حسین جعفری صاحب کی موجودگی میں قافلہ کے ایک پڑاؤ میں شرکائے قافلہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ اگر منظر حسین جعفری اور امیر حسین جعفری نے اسی محنت اور لگن سے اپنے شعری سفر کو جاری رکھا تو ایک دن ضرور یہ آسمان ادب کے درخشاں ستاروں میں شمار ہونگے۔

منصورہ احمد نے اساطیر کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی بھی بنیاد رکھی۔ ادارۂ اساطیر نے بہت اعلیٰ معیار کی کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ جن میں جناب احمد ندیم قاسمی کے تقریباً تمام تر شعری اور افسانوی مجموعوں کے نئے ایڈیشنز کے علاوہ دیگر کتب بھی شامل ہیں اور دنیائے ادب کے بے تاج بادشاہ سرکار گلزار کی کتب بھی۔

حضرت احمد ندیم قاسمی صاحب کی رحلت کے بعد منصورہ احمد اندر تک سے ٹوٹ اور بکھر چکی تھی ممکن ہے کہ وہ خود کو بکھرنے سے بچانے میں کامیاب ہو جاتی اور خود کو سمیٹ پاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے رویوں اور ہمارے طرز عمل نے منصورہ احمد کو جیتے جی مار ڈالا۔ یہ اسٹروک۔ یہ فالج۔ اور پھر نمونیا اور پھر تو جیسے بیماری نے منصورہ احمد کو آن لیا تھا۔ کبھی بلڈ پریشر کا سنتے تو کبھی نقاہت کا اکیلی جان اور اس کے ساتھ ''موتاج''

جیسے معیاری اور ضخیم جریدے کے تمام تر کام کا بوجھ اور بھاگ دوڑ بھی منصورہ احمد کے کاندھوں پر تھی۔

منصورہ احمد بیشک جدید اردو شاعری کا معتبر حوالہ معتبر نام ہے۔ منصورہ احمد نے کم از کم بھی پچیس نہ بھی سہی تو بیس برس تو ضرور دنیائے شعر و ادب میں محض اپنی جاندار شاعری کی بنا پر خوب نام اور مقام پایا اور کمایا۔ منصورہ احمد کی نظم ہو یا غزل دونوں ہی کو اعلیٰ اور عمدہ اور یکسر منفرد لہجے کا تسلیم کیا گیا لیکن خدا جانے ایسا کیا ہوا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے بعد تو جیسے منصورہ احمد کی ادبی خدمات اور عمدہ شاعری کا تذکرہ کرنے سے بھی اجتناب برتنے کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ منصورہ احمد کی شخصیت اور کردار اور فن کے منفی پہلو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی جانے لگی۔

جب ہمیں منصورہ احمد کی علالت کی خبر ملی تو صدیقہ بیگم نے میرے دورۂ لاہور کے دوران معلوم کروایا تو پتہ چلا کہ بسلسلہ علاج منصورہ احمد لاہور میں نہیں ہیں بلکہ لاہور سے باہر اپنے بھائی یا بہن کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد خود منصورہ احمد سے معلوم ہوا کہ وہ لاہور لوٹ چکی ہیں اور شاید فیصل ٹاؤن میں ہیں۔ میں اور صدیقہ بیگم منصورہ احمد کی مزاج پرسی کو گویا کہ عیادت کے لیے گئے۔ منصورہ علالت اور نقاہت کے باوجود وہ بہت تپاک سے ملیں۔ اس وقت بھی منصورہ احمد کی طبیعت ہرگز ٹھیک یا بہتر نہیں تھی اور باوجود اس کے کہ ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا گفتگو میں بھی دشواری کا سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل ہم دونوں سے محوِ گفتگو رہیں۔ دو ایک مرتبہ ہم نے اٹھنے اور رخصت کی اجازت چاہی لیکن منصورہ احمد نے ہمیں اٹھ کر آنے بھی نہ دیا اور کہنے لگیں بہت کم بہت کم لوگ ہیں کہ جن سے میں بات گویا کہ اپنی بات کر لیتی ہوں۔ ایک مسعود اشعر صاحب - خالد احمد صاحب۔ نجیب احمد صاحب ظفر معین بلے اور صدیقہ بیگم آپ اور بس۔ ہاں دو ایک نام اور بھی ہیں لیکن آپ سب سے بات کر کے میرا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور آپ سب کے سب نے مجھے ہمیشہ مخلصانہ مشوروں سے نوازا اور کسی بھی قسم کی محاذ آرائی سے اجتناب برتنے کا کہا۔

منصورہ احمد علالت کے باعث حد درجہ حساس سی ہو چکی تھیں۔ دورانِ گفتگو متعدد بار ان کی آنکھیں اشک بار اور ان کا لہجہ تھرا گیا۔ میں نے اور صدیقہ بیگم نے انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کی تو کہنے لگیں مجھے آپ سب کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے

مجھے اندازہ ہے کہ اب میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ بابا سے محبت کرنے والے بہت سوں میں سے چند ایک ہی سہی لیکن مجھ سے بھی بابا کی محبت میں محبتیں اور تعلق نبھا رہے ہیں آپ دونوں بھی انہی چند میں سے ہیں۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے اشکبار آنکھوں اور دکھ بھرے لہجے میں مزید کہا کہ اگر کبھی آپ کی یا آپ میں سے کسی کی میری کسی بات سے دل شکنی ہوئی ہو تو میں دست بستہ معذرت کی خواستگار ہوں۔ اس پر میں نے اور صدیقہ بیگم نے ان سے عرض کیا کیسی مایوسی کی باتیں کر رہی ہو۔ وہ بھی اتنی بہادر ہو کر تو منصورہ احمد نے کہا کہ نہیں مجھے اندازہ ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اور میری طبیعت میری بیماری ہرگز بھی قابو میں نہیں آ رہی۔ وقت ریت کی طرح مٹھیوں سے نکلتا چلا جا رہا ہے بلکہ آج تو میں سوچ رہی تھی کہ ناہید باجی ---- صدیقہ بیگم نے استفسار کیا کہ ناہید باجی کیا---؟؟؟ کیا ناہید قاسمی سے پھر کچھ نیا معاملہ ہوا ہے کو ------ ی ن ------ ی بات۔ تو منصورہ احمد نے کہا نہیں فی الحال تو ایسا نیا کچھ نہیں ہوا لیکن میں سوچ ضرور رہی تھی کہ ان سے فون پر بات کروں اگر اب بھی ان کے دل میں میرے حوالے سے کو---- ی بدگمانی ہے تو میں ان سے معافی مانگ لوں۔ اس تمام تر گفتگو کے بعد ہم نے پھر جانے کا ارادہ کیا تو منصورہ احمد نے صدیقہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھا لیا اور مجھ سے کہا کہ ظفر معین بلے صاحب آپ نے مجھ ہمیشہ احترام اور اعتماد بخشا اور منصورہ باجی کہہ کر مخاطب کیا۔ آج آپ کی منصورہ باجی آپ سے کہہ رہی ہے کہ بھیا ہم مدتوں بعد ملے ہیں ایک عرصہ ہوا کہ آپ اور صدیقہ بیگم کے ساتھ بیٹھنا اور بات کرنا بھی نصیب نہ ہو سکا اور کب ہو سکے گا یا نہیں کون جانے۔ اتنی دیر میں صدیقہ بیگم کا کہیں سے فون آ گیا اس کمرے میں سگنلز کا کچھ اشو تھا تو وہ اٹھ کر کمرے سے باہر جا کر فون سننے لگیں۔ مجھے تشویش کا احساس ہوا تو میں صدیقہ بیگم کے پیچھے پیچھے پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں ظفر مینوں شدید پکھ لگی اے ہن کی کرنا اے۔ دس مینوں چھیتی چھیتی۔ میں نے کہا کہ اجازت لیں منصورہ باجی سے تو صدیقہ بیگم تپ کر جھنجھلا کر بولیں ہالے تیکر تے اوہ شرافت دی شرافت وچ ریکویسٹ کر رہی اے کہ تسی لوکی تھوڑی دیر ہور نہ جائے۔ فیر اوہ جدوں مولا جٹ دا ڈانگ چک کے وی ساڈے ول تکے گی تے وس کی بنے گا تیرا تے میرا۔ قصہ مختصر ہم دوبارہ منصورہ باجی کے پاس جا بیٹھے اور ایک دو ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد صدیقہ بیگم

نے منصورہ احمد سے پوچھا کہ تمہارا پرہیز کس کس چیز کا۔ تم کیا چیز شوق سے کھا سکتی ہو۔ منصورہ احمد بتاتی رہیں اور میں سنتا رہا۔ اور پھر میں نے پہلے چپکے سے صدیقہ بیگم کے فون سے کہیں کسی مخصوص جگہ پر فون کیا اور میسج بھی۔ اور پندرہ منٹ بعد منصورہ احمد سے کہا کہ صدیقہ باجی کی کچھ میڈیسن لینی ہے آپ لوگ بیٹھیں میں آیا ابھی کچھ ہی دیر میں اور پینتالیس پچاس منٹ میں اپنے ٹھکانے سے کھانا تیار کروالایا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہماری خواہش کے احترام میں شاید منصورہ احمد بھی کچھ کھالیں اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

منصورہ احمد علمی اور ادبی حلقوں کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ان کی شخصیت کم وبیش تیس پینتیس برس موضوع بحث رہی اور وہ بھی مختلف زاویوں اور حوالوں سے۔ خود اپنی ذاتی حیثیت میں بھی اور احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی کی حیثیت سے بھی۔ حلقہ ندیم اور حلقہ فنون اور مخالف دھڑوں کے ساتھ ساتھ غیر جانبدار حلقوں میں بھی۔ 1986 سے 2006 تک حضرت احمد ندیم قاسمی کا جاری کردہ مقبول ترین ادبی جریدوں اور رسالوں سے ایک ادبی رسالے ''فنون'' کے ادارتی بورڈ میں شامل رہیں۔ جبکہ منصورہ احمد کا نام بطور شریک مدیرہ دس برس سے کم عرصہ چھپا لیکن عملی طور پر منصورہ احمد کی بھرپور معاونت شامل حال رہتی۔ منصورہ احمد نے اساطیر کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی بھی بنیاد رکھی۔ ادارۂ اساطیر نے بہت اعلیٰ معیار کی کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ جن میں جناب احمد ندیم قاسمی کے تقریباً تمام تر شعری اور افسانوی مجموعوں کے نئے ایڈیشنز کے علاوہ دیگر کتب بھی شامل ہیں اور دنیائے ادب کے بے تاج بادشاہ سرکار گلزار کی کتب بھی۔ منصورہ احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''طلوع'' 1997 میں شائع ہوا۔ 1998 میں طلوع کو وزیراعظم ادبی ایوارڈ ملا۔

لاہور سے ملتان اور پھر ملتان سے کراچی سکونت اختیار کرنے پر بھی قاسمی صاحب سے مسلسل رابطہ قائم رہا۔ مجھے اور میری بہن عذرا کمال کو کراچی میں بھی بارہا ان کی میزبانی کا اعزاز حاصل ہوتا رہا۔ وہ خیریت دریافت کرنے کے لیے بھی فون کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی تقریب کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی ''منصورہ احمد''، محسن احسان اور احمد فراز کراچی آئے ہوئے تھے۔ قاسمی صاحب نے آتے ہی مجھے مطلع کیا۔ پھر میری بہن عذرا کمال اور میرے بہنوئی محترم کمال اختر صاحب انہیں اپنے ساتھ لے آئے۔ آواری سے سی ویو تک کا سفر

بھی خوشگوار رہا اور جیسے ہی خیابان شمشیری ویو کی جانب مڑے تو ایک طرف تو تاحدِ نگاہ سمندر ہی سمندر تھا اور اس کے سامنے سی ویو اپارٹمینٹس۔ قاسمی صاحب نے یہ منظر دیکھا تو کہا کہ کمال صاحب اگر آپ کچھ دیر کے لیے گاڑی روک لیں تو اس منظر کو تسلی سے دیکھ سکوں گا۔ جیسے ہی گاڑی رکی احمد ندیم قاسمی صاحب اور منصورہ احمد گاڑی سے اتر گئے سمندر کا نظارہ کرتے رہے اور سمندری ہوا کو انجوائے۔ کچھ دیر کے بعد خود ہی کہنے لگے کہ واپسی پر ایک مرتبہ پھر رُک لیں گے پانچ دس منٹ۔ گھر پہنچ کر گھنٹوں محفل جمی رہی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ پھر کیونکہ اسی رات کو وہ تقریب بھی تھی کہ جس میں شرکت کے لیے یہ تمام مہمانانِ گرامی کراچی تشریف لائے تھے لہٰذا احمد ندیم قاسمی صاحب نے شام کی چائے پر ہی اعلان فرمادیا کہ عذرا بیٹی ہمیں آٹھ بجے تک یہاں سے جانا ہوگا امید ہے آپ ہمیں خوش دلی سے رخصت کریں گی۔ عذرا باجی نے کہا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن خوش دلی سے تو ہرگز بھی نہیں کیونکہ ابھی تک تو آپ سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں ہوسکی۔ اگر آپ ہمیں کم از کم دو چار روز کی میزبانی کا اعزاز بخشیں تو ضرور۔ قاسمی صاحب نے کچھ دیر کچھ سوچا پھر کہا کہ میں آج ہی اپنی میزبان ٹیم سے بات کرتا ہوں کہ ہماری واپسی کی بکنگ دو تین روز بعد کی کروادیں کیونکہ میں نے بیٹی عذرا کی خواہش کے احترام میں مزید دو تین رکنا ہے۔ اگلے ہی روز صبح دس بجے کے قریب قاسمی صاحب کا فون آیا اور انہوں نے فرمایا کہ تین روز بعد کی بکنگ ہوسکی ہے۔ ہم سب قاسمی صاحب اور منصورہ احمد کو آواری سے سی ویو لے آئے۔

قاسمی صاحب کی گرتی ہوئی صحت کے باعث ''فنون'' کی بہت حد تک ذمہ داری بھی منصورہ احمد کے کاندھوں پر آگئی تھی۔ جب ان کا نام مدیر منتظم/شریک مدیرہ کے طور پر ''فنون'' میں شائع ہونے لگا تو یہ بات بذاتِ خود ایک نیا موضوع بن گیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی قائم کرنے کی کوشش کی جانے لگی کہ احمد ندیم قاسمی کا تو بس نام ہی استعمال ہو رہا ہے ان کا اتنا عمل دخل نہیں رہا۔ تمام تر مواد matter کا انتخاب منصورہ احمد ہی کرتی ہیں۔ اور جب منصورہ احمد کی شاعری بالخصوص نظمیں تواتر کے ساتھ فنون میں شائع ہونے لگیں تو ایک نئے موضوع نے جنم لیا۔ پھر کیا ہوا۔ امجد اسلام امجد کے مطابق ''اس دوران میں اس نے بطور شاعرہ کے بہت ترقی کی۔ اور بلاشبہ اپنے لیے ایک نام اور مقام حاصل کیا لیکن یہاں بھی وہی افراط و تفریط کا ماحول

بن گیا کہ فنون کا وہ حصہ جو قارئین کے خطوط اور آرا پر مبنی ہوتا تھا کم و بیش منصورہ نامہ بن کر رہ گیا۔ جس کا ردِعمل یہ ہوا کہ اس کی سچ مچ کی بہت اچھی شاعری بھی اس کریڈیبلٹی سے محروم ہوگئی جو اس کا حصہ تھا۔''

اس حوالے سے الگ بحث ہوتی رہی بہرحال کسی نہ کسی طور منصورہ احمد کا ہر عمل ایک نئے موضوع کو جنم دیتا رہا۔

انتظار حسین صاحب نے اپنے ایک کالم میں احمد ندیم قاسمی صاحب اور منصورہ احمد کے اس باہمی تعلق و ربط اور رشتے کو ان الفاظ میں بیان کیا۔۔ ''بے شک اس بی بی نے قاسمی صاحب کے لواحقین کو شکایت کے مواقع فراہم کیے تھے مگر خدا لگتی کہیں گے اور سنی سنائی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی کہ اس منہ بولی بیٹی نے باپ کی خدمت گذاری بہت جی لگا کر کی تھی۔ قاسمی صاحب نے اسے بلاوجہ تو بیٹی نہیں بنایا تھا''

ہم انتظار حسین صاحب کی رائے سے سو فیصد اتفاق کرتے ہوئے اور ان کے موقف کی تصدیق کرتے ہوئے بس اتنا کہنا چاہیں گے۔ منصورہ احمد نے بے شک احمد ندیم قاسمی صاحب کی حد درجہ خدمت کی اور ان کی تمام تر تخلیقات اور تصانیف کے تحفظ کا سامان بہم پہنچایا اور ان کی کسی بھی تصنیف یا تخلیق تو کجا ایک سطر کو بھی غیر محفوظ نہیں رہنے دیا۔ بلکہ بہت سی گمشدہ تخلیقات کو تلاش کر کے محفوظ کیا۔ ''فنون'' کے بھی جملہ امور میں جس حد تک ممکن ہوسکتا تھا اس سے بڑھ کر معاونت کی لیکن ان تمام تر اوصاف اور خدمات کے چشم دید گواہ ہونے کے ساتھ ساتھ ببانگ دہل اعتراف کرتے ہوئے ہم یہ بات کہیں گے بلکہ جناب انتظار حسین صاحب کے ہی الفاظ کو دہراتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہیں گے کہ بے شک منصورہ احمد نے احمد ندیم قاسمی صاحب کے لواحقین اور پسماندگان کو شکایت کے مواقع فراہم کیے تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ منصورہ بھی دودھ کی دھلی تو تھی نہیں ہماری طرح بندہ بشر تھی اس کے ایسے کسی بھی عمل یا اقدام کی ہم پرزور مزمت کرتے ہیں اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کی علمی و ادبی وراثت کی وارث محترمہ ناہید قاسمی صاحبہ تھیں اور ہیں اور اللہ انہیں سلامت رکھے۔ آمین۔

یہاں جب اتنی بہت سی تکلیف دہ باتیں ہو چکی ہیں تو ہم اس بات کا بھی اعتراف کر لیں کہ منصورہ احمد کے انتقال کے فوراً بعد ہم نے ناہید قاسمی صاحبہ کو فون کیا تھا اور ہم نے ان سے عاجزانہ گزارش کی تھی کہ ناہید باجی

آپ بڑی ہیں ہمارے لیے قابل صد تعظیم ہیں آپ کو منصورہ احمد کے انتقال کی خبر دینے کے ساتھ آپ سے ایک دست بستہ گزارش ہے اور وہ یہ کہ آپ اعلیٰ ظرف ہیں اپنے بابا احمد ندیم قاسمی صاحب کے نام پر ان کے صدقے میں منصورہ احمد کی کوتاہیوں کمزوریوں اور خطاؤں اور زیادتیوں کو درگزر اور معاف فرمادیں۔ میں آپ سے منصورہ کی طرف سے معافی کا طلبگار ہوں۔ ایک عظیم، زیرک اور بڑے انسان کی عظیم بیٹی سے ہمیں بالکل ایسے سے ہی جواب کی توقع تھی۔ سلام ہے محترمہ ناہید قاسمی صاحبہ کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی اور جذبہ عفو و درگزر کو انھوں نے فرمایا کہ میں نے معاف کیا اللہ بھی اس کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ سلامت رہیں ناہید باجی پروردگار آپ کے گلشن کو شاد و آباد و شاداب رکھے۔ آمین

جب لاہور میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا پچھتر سالہ جشنِ ولادت منایا گیا تو اس کی صدارت جناب مشتاق احمد یوسفی صاحب نے فرمائی تھی۔ ملک بھر سے محبان احمد ندیم قاسمی نے بھرپور انداز میں شرکت فرمائی تھی۔ بیرون ملک سے بھی کثیر تعداد میں ادب دوستوں نے شرکت فرمائی جن میں جناب نصر ملک صاحب بھی شامل ہیں۔ ملتان سے پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب بھی تشریف لائے تھے اور انھوں نے بلے ہاؤس میں قیام فرمایا تھا۔ جشن احمد ندیم قاسمی کے اختتام پر بہت سے احباب و اصحاب والد گرامی قبلہ سید فخر الدین بلے شاہ صاحب سے ملنے (اور ان کی عیادت کرنے) شادمان جی او آر تھری میں بلے ہاؤس پہنچنا شروع ہوگئے۔ جن میں مشتاق احمد یوسفی صاحب - جناب مختار مسعود صاحب۔ جناب مسعود اشعر صاحب اور ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب۔ شاہد واسطی۔ کلیم عثمانی صاحب۔ حفیظ تائب صاحب۔ قتیل شفائی۔ طفیل ہوشیار پوری اور مسعود اشعر صاحب کے علاوہ بھی دیگر بہت سے احباب تھے۔ اجمل نیازی صاحب نے مسعود اشعر صاحب سے پوچھا کہ جشنِ ندیم کیسا رہا اور آپ کو کیسا لگا تو مسعود اشعر صاحب نے فرمایا کہ یہ جشن تو تھا لیکن دراصل اعلانِ وراثت کا معاملہ تھا۔ جشن میں تو وراثت کا اعلان کیا گیا۔ کیک کاٹتے وقت ایک طرف ڈاکٹر ناہید قاسمی صاحبہ تھیں اور ایک طرف منصورہ احمد صاحبہ۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات کے بعد معروف شاعرہ اور سابق شریک مدیرہ فنون منصورہ احمد صاحبہ نے احمد ندیم قاسمی صاحب کی یاد میں رسالہ ''مونتاج'' کا آغاز کیا۔ ''مونتاج'' کی مجلس مشاورت میں جناب

مسعود اشعر صاحب بھی شامل تھے۔
''مونتاج'' نے احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے شاندار اشاعت خاص کا اہتمام بھی فرمایا تھا۔ آپ اس اشاعت خاص کو ایک شاہکار اور ایک تاریخی دستاویز قرار دے سکتے ہیں۔
منصورہ احمد صاحبہ کا بھی فون آتا تو وہ تفصیلی گفتگو فرماتی تھیں اور برملا اس بات اعتراف کرتی تھیں کہ ظفر بلے بھائی مجھے جس قدر حوصلہ جناب مسعود اشعر صاحب نے دیا اور جتنی حوصلہ افزائی فرمائی میں بتا نہیں سکتی۔ فون پر آپ سے بات کر کے اور مسعود اشعر صاحب سے مل کر میری زندگی آسان ہو جاتی ہے۔
منصورہ احمد صاحبہ ہمیشہ مجھے میری ہی کہی ہوئی باتیں یاد دلایا کرتی تھیں کہ ''ہمت نہیں ہارنی حوصلے بلند رکھنے ہوں گے بابا احمد ندیم قاسمی صاحب کی آنکھیں بند ہونے پر بہت سے چہرے بے نقاب ہو جائیں گے''
حضرت احمد ندیم قاسمی صاحب کی رحلت کے بعد منصورہ احمد نے ادبی جریدہ ''مونتاج'' جاری کیا۔ جس میں جناب احمد ندیم قاسمی کا نام بطور میر کارواں سب سے اوپر پبلش کیا جاتا تھا۔ ''مونتاج'' کا پہلا شمارہ احمد ندیم قاسمی نمبر تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے منصورہ احمد نے مونتاج کے تقریباً گیارہ ہی شمارے منظر عام پر لا سکیں۔
''مونتاج'' کے بارہویں شمارے کا مسودہ کمپوز بھی ہو چکا تھا بلکہ نصف سے زیادہ مواد کی تو پروف ریڈنگ بھی ہو چکی تھی۔
طلوع کے بعد بلکہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں منصورہ احمد نے اپنا دوسرا شعری مجموعہ آسمان میرا ہے مرتب کرنا شروع کیا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ منصورہ احمد اپنی زندگی ہی میں اپنا دوسرا شعری مجموعہ ''آسمان میرا ہے'' مرتب کر چکی تھیں لیکن اس سے قبل کہ وہ زیور طباعت سے آراستہ ہوتا منصورہ احمد کا اس جہانِ فانی سے دانہ پانی اٹھ گیا۔ اور آسمان میرا ہے ------ ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ اللہ جانے کہاں چلا گیا۔ ''آسمان میرا ہے''۔
یہاں ایک بات کی وضاحت اشد ضروری ہے اور وہ یہ کہ منصورہ احمد کی زندگی کے ان پانچ برسوں کے حوالے سے ہماری تمام تر معلومات کا ذریعہ خود منصورہ احمد ہیں۔ ان سے فون پر مسلسل رابطہ تھا۔ بہت سے امور پر باہمی مشورے ہوتے تھے۔ لیکن جب منصورہ احمد شدید علالت کا شکار ہو چکی تھیں اور فالج کے حملے کے بعد تو جیسے وہ ڈھیر ہی ہو چکی تھیں۔ بعض اوقات ان کی زبان کی لکنت کی وجہ سے ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں آتے تھے۔ کیونکہ ان کی آواز سے ان کی نقاہت اور زبان کی لکنت کا بخوبی اندازہ

ہوتا تھا۔ حضرت احمد ندیم قاسمی صاحب کی رحلت کے بعد منصورہ احمد اندر تک سے ٹوٹ اور بکھر چکی تھی ممکن ہے کہ وہ خود کو بکھرنے سے بچانے میں کامیاب ہو جاتی اور خود کو سمیٹ پاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے رویوں اور ہمارے طرزِ عمل نے منصورہ احمد کو جیتے جی مار ڈالا۔ یہ اسٹروک۔ یہ فالج۔ اور پھر نمونیا اور پھر تو جیسے بیماری نے منصورہ احمد کو آن لیا تھا۔ کبھی بلڈ پریشر کا سنتے تو کبھی نقاہت کا اکیلی جان اور اس کے ساتھ ''مونتاج'' جیسے معیاری اور ضخیم جریدے کے تمام تر کام کا بوجھ اور بھاگ دوڑ بھی منصورہ احمد کے کاندھوں پر تھی۔

منصورہ احمد کی زیرِ ادارت ''مونتاج'' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آنے سے قبل ہی ایک جناب مسعود اشعر صاحب کا فون آیا اور انھوں نے خیریت دریافت کرنے کے بعد فرمایا کہ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ منصورہ احمد جب جب بھی آپ سے رابطہ کرتی ہیں تو آپ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور آپ کے مشوروں میں منصورہ مجھے شامل رکھتی ہیں۔ آپ کے توسط سے منصورہ احمد کو ''مونتاج'' کے لیے قاسمی صاحب کے حوالے سے چند بہت اچھے مضامین بھی موصول ہوئے۔

''مونتاج'' کے نام سے رسالہ جاری کیا گیا جس کی مجلسِ مشاورت میں مسعود اشعر بھی شامل تھے۔ آئینہ میں مسعود اشعر نے بہت خوبصورتی سے منصورہ احمد کی شخصیت اور خدمات کا ذکر ''منہ بولی بیٹی'' کے عنوان کے تحت کیا۔ اور بہت خوب کیا۔

مسعود اشعر صاحب وہ فرماتے ہیں کہ ''احمد ندیم قاسمی نے اسے منہ بولی بیٹی بنایا تھا اور اس نے بیٹی بن کر دکھا دیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کے آخری تیس پینتیس سال اس نے ان کی ایسی خدمت کی کہ کیا کوئی سگی بیٹی کر سکے گی۔'' خود احمد ندیم قاسمی صاحب نے پروفیسر فتح محمد ملک کے نام ایک خط میں جو فتح محمد ملک کی کتاب ''ندیم شناسی'' میں شامل ہے، منصورہ احمد کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا۔۔ ''اگر میری منصورہ بیٹی میری بھرپور خدمت نہ کر رہی ہوتی تو میری سالگرہ کے بجائے آپ میری برسی منا رہے ہوتے۔'' اور یہی نہیں بلکہ بحیثیت منہ بولی بیٹی کے منصورہ احمد نے جو اپنے بابا حضرت احمد ندیم قاسمی صاحب کی بیس پچیس برس خدمت کی اس کا بھی جناب مسعود اشعر صاحب نے اس کا بھی خصوصی انداز اور الفاظ میں تذکرہ کیا۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ منصورہ احمد کسی نہ کسی حوالے سے موضوع بحث بھی بنی رہی اور متنازعہ بھی۔

☆☆☆☆☆

امی

امی کے متعلق جب بھی لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ آنسو بہانے لگتی ہیں۔ ماں بچے کا تعلق ہی ایسا ہوتا ہے۔ بچہ اس وجود سے بے اعتنا نہیں ہو سکتا جس کا وہ خود حصہ رہ کر پلتا ہے۔ اس لئے ماں بچے کی محبت فطری ہوتی ہے۔ یہ تعلق مقناطیسی کشش کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔ جب وہ زندہ ہوتی ہے تو ہم دیگر نعائم قدرت کی طرح اس سے بے نیاز رہتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ جب یہ نہ ہو گی تو ہم کیا کریں گے؟ کیسے جئیں گے؟

سکول سے آتے ہی سارے بہن بھائی امی! امی! کی پکار شروع کر دیتے۔ اگر امی کی شکل نظر آنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہم بے چین ہو جاتے۔ بعض اوقات تو اکتا کہ جواب دیا جاتا

''مر گئی تمہاری امی۔'' ہم بسور کے رہ جاتے۔

ایک دفعہ ایک پھوپھی زاد کی شادی میں شرکت کے لئے ہم ابو کے ساتھ چلے گئے۔ گھر سے تو بڑے پُر جوش انداز میں نکلے مگر ٹرین میں بیٹھتے ہی امی کی یاد ستانے لگی۔ گجر خان کے ایک گاؤں میں پھوپھو کے گھر پہنچے تو اگلی صبح ہی امی کی یاد آ گئی اور بڑی شدت سے آئی۔ پھوپھا کہنے لگے ''یہ تو ٹھیک بات نہیں ہے۔ کل تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم کیا کرو گی۔''

میں یہ سن کر سوچنے لگی ابھی تو وہ وقت آنے میں دیر ہے۔ ابھی تو میں صرف ساتویں جماعت میں ہوں۔

پھر سچ مچ میں ایسا ہوا کہ وہ نہیں رہیں۔ وہ چلی گئیں۔ اپنی آٹھ بیٹیوں اور دو بیٹوں کو سوگوار چھوڑ کر وہ چلی گئیں۔ وہ اپنی ان بیٹیوں کو چھوڑ گئیں جنھیں وہ اکیلا چھوڑ کے کہیں نہیں جاتی تھیں کہ میری جوان بیٹیاں گھر میں اکیلی ہوں گی۔ جب تک سب سو نہ جاتیں وہ جاگتی رہتیں۔ جب رب کا بلاوہ آیا تو وہ ان سب کو رب کے حوالے کر کے خود رب کے پاس چلی گئیں۔ سب فکروں سے آزاد ہو گئیں۔

امی چلی گئیں۔ دوسرے جہاں چلی گئیں۔ میری امی چلی گئیں۔ وہ منوں مٹی تلے دفن ہو گئیں۔

سمیرا کیانی

جیسے کم گوئی سے انہوں نے زندگی گزاری۔ ویسے ہی خاموشی سے وہ موت کی وادی میں بھی چلی گئیں۔ اپنے دکھ، اپنے غم اور اپنی پریشانیاں سب اسی دنیا میں چھوڑ کر۔ جانے سے پہلے میرے خواب میں آئیں۔ کہہ رہی تھیں ''میں نہیں بچوں گی۔''

میں اس وقت ایم۔اے سال اوّل کی طالبہ تھی۔ ہوسٹل میں مقیم تھی۔ امی کو علاج کے لئے پنڈی لے جایا گیا تھا۔ ہیپاٹائٹس جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ تب یہ مرض ایسا عام نہیں ہوا تھا۔ کوئی اس مرض سے واقف نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کو مرض کی تشخیص میں کافی دقت پیش آئی تھی۔ سی۔ایم۔ایچ والے تشخیص میں کامیاب تو ہو گئے تھے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ ان کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ جیسی تیسی اور جتنی بھی گزری وہ اپنی گزار چکی تھیں۔ اب بلاوہ آ چکا تھا۔

وہ اپنے سخت گیر شوہر کی بھی اس قدر اطاعت گزار تھیں کہ انہیں جی حضوریا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے ان کی یہ دبو اور مغلوب طبیعت اچھی نہ لگتی۔ جنھوں نے اوائل جوانی میں ان کی کوئی پروانہ کی تھی۔ ابو کو جدید وضع قطع کی؛ پڑھی لکھی؛ ملازمت پیشہ؛ باتونی اور تیز طرار لڑکیاں پسند تھیں۔ وہ سادہ سی؛ خاموش طبع اور سادہ مزاج کی بیوی تھیں۔ ہاں میں ہاں ملانے والی۔ جی حضوری کرنے والی۔ بہت کچھ سن کے بھی خاموش رہنے والی۔ وہ خود کو تو نہ بدل سکیں مگر انہوں نے بیٹیوں کو بہترین تعلیم دلائی۔ ملازمت کی طرف مائل کیا۔ ماڈرن لباس پہنایا۔ ہر لحاظ سے جدید دور کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا۔

ان کا نام پروین اختر تھا۔ ابا جی انہیں پچو کہتے تھے۔ اپنی آٹھ بیٹیوں میں سے چھ کے نام کا لاحقہ بھی انہوں نے پروین ہی رکھا۔ جیسے میرا نام سمیرا پروین کیانی رکھا گیا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اس نام سے تھوڑی سی خائف ہو گئی۔ اس لئے کہ پروین نام کی خواتین کو فرح و شاداں کم ہی دیکھا۔ اس لئے میں نے شعوری طور پر خود کو سمیرا پروین کہلانا پسند نہ کیا۔ خیر یہ تو ایک الگ بات ہے۔ بات تو امی کی ہو رہی ہے جو ابو کی پچو تھیں۔ جو ازدواجی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ابو کی توجہ کی طالب تھیں مگر اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ان کے دل کی رانی تھیں۔ گھر کی ملکہ تھیں۔ انہیں وہ سب مل گیا تھا۔ جس کی ایک عورت کو خواہش ہوتی ہے۔

مزاجاً وہ قنوطی تھیں۔ جلد نا امید اور مایوس ہو جاتی تھیں۔ آنکھیں عموماً نم دکھتیں۔ ہماری آٹھویں بہن کے بعد دو جڑواں بچوں کی

پیدائش کی امید ہوئی تو ان کی حالت بہت خراب رہنے لگی۔ انہیں لگتا کہ اس بار شاید وہ بچ نہ پائیں گی۔ ہماری سب سے چھوٹی پھوپھی ابھی کنواری تھیں۔ انہیں اپنے پاس بٹھا کر کہتیں کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری بیٹیوں کا خیال رکھنا۔ اللہ کے فضل سے خیر خیریت سے دو جڑواں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ جو شیر خوارگی ہی میں انتقال کر گئیں۔

اپنے دکھوں اور پریشانیوں سے بیٹیوں کو لاعلم رکھتیں۔ آج اسی بات کا تو دکھ ہے کہ میں امی سے کچھ کہہ سن نہ سکی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ "مانواں تے دھیاں رل بیٹھیاں نی مائے۔" اس کا بہت قلق ہے۔ میں نے بہت کچھ کہنا تھا ان سے۔ بہت کچھ بتانا تھا۔ اپنے دکھڑے سنانے تھے۔ بس آہ بھر کر یہ ہی کہتی ہوں:

"مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال"

.....

انہوں نے باقاعدہ رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ بس قرآن پاک پڑھا تھا لیکن مطالعہ کی شوقین تھیں۔ اخبار ضرور پڑھتیں۔ اخبار جہاں میں سے تین عورتیں تین کہانیاں نہیں چھوڑتی تھیں۔ سردی کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے انگیٹھی دہکا کے رکھتیں۔ اس کے اردگرد سب بچوں کو پڑھنے کے لئے بٹھا دیتیں۔ خود پڑھاتیں۔ صائمہ بہن کو پڑھانے میں اور اردو سکھانے میں انھیں بہت محنت کرنا پڑی مگر اس سے بھی عاجز نہ آئیں۔ ایک ایک لفظ کئی کئی بار پڑھاتیں۔ مار پیٹ سے پڑھانے کی قائل نہ تھیں۔ سمجھا بجھا کے پڑھائی کی طرف مائل کرتی تھیں۔ مثلاً پڑھو لکھو۔ پڑھ لکھ جاؤ گی تو کچھ بن جاؤ گی۔ محتاجی نہیں رہے گی۔ مجھے دیکھو میرے جیسی نہ بننا۔" بس ان کی اس انداز سے کہی باتیں دل میں گھر کر جاتیں۔

جب رات کے وقت بجلی چلی جاتی تو ہم سب کو اپنے اردگرد بٹھا کر کہانیاں سنایا کرتیں۔ یہ میری امی ہی تھیں جنہوں نے میرا کہانی سے رشتہ جوڑا۔ کہانی سے محبت سکھائی۔ کبھی کبھی نصیحتیں بھی کرتیں۔ ایک نصیحت میں ان کی کبھی نہیں بھولتی۔ وہ کہا کرتی تھیں۔

"مرد کا کبھی اعتبار نہ کرنا۔ وہ تتے (گرم) توے پر بیٹھ کر بھی اپنی بات کا یقین دلائے تو کبھی مت کرنا۔"

صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر میں ہی جسم کمزور ہو گیا تھا۔ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ قرآنِ پاک روانی سے نہ پڑھ سکتی تھیں اٹکنے لگی تھیں لیکن پڑھتی ضرور تھیں۔

معمول تھا کہ ظہر اور عصر کے درمیان سورتیں پڑھتیں اور پانی پہ پھونک مار کے سب بچوں کو پلاتیں۔ آخری دنوں میں تو علالت کے باعث حرکت محال ہوگئی تھی۔ نماز بھی نہ پڑھ پاتیں تو بہت افسوس کا اظہار کرتیں۔

وہ اس عمر میں دادی بن چکی تھیں میں جس عمر میں ماں بننے کی آرزو لیے بیٹھی ہوں۔ ساس بہو کی روایتی لڑائی ہمیں دیکھنے کو نہ مل سکی۔ وہ صلح جو طبیعت کی تھیں۔ دبی ہوئی شخصیت کی حامل تھیں۔ شوہر اور بیٹے دونوں بہو کے دلدادہ تھے۔ اگر بہو کے شکوے کی ضرورت پڑی بھی تو خاموش ہوگئیں۔ کس سے کہیں اور کیا کہیں۔ اس لئے بہو سے کبھی اونچی آواز میں بات نہ کی۔ ساس بہو میں جھگڑا اسی گھر میں نہیں ہوتا جہاں ساس دب جائے۔ مغلوب ہو جائے۔ سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش رہے۔ سب سہہ جائے۔ برداشت کر لے۔ وہ سب کچھ برداشت کر لیتی تھیں۔

محبت اور دردمندی کے خمیر سے گوندھی گئی تھیں۔ بھائیوں بھابیوں کا بہت احساس کرتیں۔ ایک بھائی کے معاشی تنگی کے دنوں میں دال سبزی راشن وغیرہ اس کے گھر بھجوا دیتیں۔ یہ اور بات ہے کہ بھابی پھر بھی کبھی خوش نہ ہوئی نند جو تھی۔ اپنے پوتوں سے بھی انہیں غیر معمولی محبت تھی۔ جس کا اظہار وہ ان کے سب کام اپنے ذمے لے کر کرتیں۔ بھابی کو اس حوالے سے بھی آرام سکھ ہی میں رکھا۔ اسے اپنی خوراک کا خصوصی خیال رکھنے کو کہتیں۔ دودھ باقاعدگی سے پینے کی تلقین کرتیں۔

حریص نہیں تھیں۔ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے کی ان میں طمع نہ دیکھی۔ جو مل گیا وہ کھا پی؛ پہن اوڑھ لیتی تھیں۔ بہت صفائی پسند؛ کفایت شعار اور سلیقہ مند تھیں۔ اس لئے کبھی شوہر سے گلہ نہ کیا۔ قناعت وصبر کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔

آخری چند سالوں میں کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے خالص نسوانی عارضہ لاحق ہو گیا۔ بچہ دانی نکلوانا پڑی۔ اس کے بعد وہ کبھی مکمل طور پر صحت مند نہ دکھائی دیں۔ دردِ شقیقہ کی بھی شکایت رہتی۔ اکثر سارا سارا دن نڈھال سی چارپائی پر پڑی رہتیں۔ یادداشت خاصی متاثر ہو چکی تھی۔ ایک دن نماز کے لئے کھڑی ہوئیں تو قبلہ کی سمت بھول گئیں۔ دوائی کھانے لگیں تو اپنے چھوٹے سے پیسوں والے بٹوے کو ٹٹولنے لگیں۔ ایک نوٹ نکالا اسے الٹا سیدھا کر کے دیکھنے لگیں۔ پوچھنے پر کہنے لگیں

''دوائی کھانے لگی ہوں۔ یہ دوائی ہے۔''

ہماری آنکھیں غم سے چھلک پڑیں۔ ابھی تو یہ آغاز تھا۔

ایک دن تو دن کے وقت ان کی نیند کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ سب کو تشویش لاحق ہوئی۔ بہت جگایا تو ہوں ہاں کر کے پھر آنکھیں بند کر لیتیں۔ ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے معائنے کے بعد بتایا کہ جگر خون نہیں بنا رہا۔ خون کی کمی ہے چار مہینے خانیوال ہی میں ان کا علاج ہوتا رہا۔

ڈاکٹر خون کی بوتلیں لگاتا رہا۔ میں نے بھی ایک بوتل دی تھی۔ جس کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ لڑکیوں کو خون دینے کے لئے نہ لائیں۔

صحت روز بروز تیزی سے گرنے لگی۔ پنڈی سی۔ ایم۔ ایچ لے گئے۔ ڈاکٹروں کو بیماری کی تشخیص میں خاصا وقت لگا۔ امی کو ہیپاٹائٹس تھا۔ اس وقت یہ مرض عام نہ ہوا تھا۔ میرے جیسے یہی سمجھتے رہے کہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس وقت اس بات کا بھی احساس نہ تھا کہ جب ڈاکٹر پرسوز انداز میں کہے کہ بس دعا کریں تو اس کا کیا مطلب لینا چاہئے؟ خیر چار مہینے وہاں علاج ہوتا رہا۔ ۲۵ مئی ۲۰۰۰ کو بھائی کا یونیورسٹی ہاسٹل میں فون آیا کہ امی کی طبیعت بہت خراب ہے ہم سب پنڈی جا رہے ہیں۔ تم بھی آ جاؤ۔ میں نے سوچا اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو وہ گھر لائی جائیں نہ کہ ہم جائیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ روتی دھوتی پہلی بار ہاسٹل سے گھر پہنچی تو میرے ماموں کے بیٹے نے (جو میرا پھوپھی زاد بھی تھا) روتے ہوئے بتایا کہ پھوپھو فوت ہو گئی ہیں۔ اب رونے دھونے کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ میت ان کی پنڈی سے لائی جا رہی تھی۔ اپنی جان دینے اپنے آبائی وطن لے جائی گئی تھیں۔ سوچتی ہوں جن بیٹیوں کے لئے وہ سدا فکرمند رہتی تھیں۔ انہیں اس ظالم دنیا کے حوالے وہ خوشی سے تو نہیں کر گئی ہوں گی۔ وہ بھی بہت روئیں، کرلائیں اور بے چین تو ہوئی ہوں گی۔

اس وقت میں روئی بہت۔ دکھ بھی بہت ہوا مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ کیا کھویا ہے؟ یہ بعد میں پتہ چلا کہ چھاؤں سے محروم ہو گئی ہوں۔ برگد کی طرح کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں سے۔ پیار کرنے والی ماں سے۔ کہے بغیر دکھوں اور ضرورتوں کو سمجھنے والی ماں سے۔ ان کے بعد میرے کانوں میں کبھی یہ پیار بھری آواز ہی نہ آئی۔ نوشا! بگو گوشا! میرا بگو گوشا!۔ مجھے سب پیار سے نوشی کہتے تھے۔ انہیں جب مجھ پر بہت زیادہ پیار آتا تو نوشا! بگو گوشا بلاتیں۔ اللہ تعالیٰ میری ماں کو جنت کے باغوں کا مکیں بنائے۔ اُن کے درجات بلند کرے۔ آمین

☆☆☆☆☆

جون ایلیا کا ایک شعر

کوچۂ زلفِ درازاں میں رچائیں گے جنوں
دشت و صحرا میں پھریں گے نہ پریشاں اب کے
(جون)

گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر یہ شعر خاصا مقبول رہا اور یار لوگ اسے جگہ جگہ (اکثر بے محل) لکھتے رہے۔ شاید اسی لیے ایک دوست نے اس شعر پر کچھ گفتگو کرنے کا تقاضا کیا۔ ہم نے سوچا کہ یہ مشق سب کے سامنے کی جائے۔

اس شعر میں یہ بات تو ظاہر ہے کہ پہلا اور دوسرا مصرع ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہیں۔ اس مقابلے کو ہم دو تین حصوں میں توڑ کر دیکھ لیتے ہیں۔ اسی میں شاید ذہن کو کوئی وضاحت مل جائے۔ مجموعی تعبیر پر آخر میں بات کر لیں گے۔

"کوچۂ زلفِ درازاں" اور "دشت و صحرا"

دشت و صحرا عشق کے باب میں خاصا روایتی استعارہ ہے - وحشت، ویرانی، بیکرانی، شدت حالات، تنہائی وغیرہ کے سب کلاسیکل معانی اس میں شامل ہیں مگر اس روایتی روش کے برعکس کوچۂ زلفِ درازاں نہ صرف اصطلاح اور ترکیب نئی معلوم ہوتی ہے بلکہ دیوانگی کے عالم میں ستم کے مرکز میں ہی رہنا، بجائے اس کے کہ بستی سے نکل کر ویرانے میں خوار ہوا جائے، منفرد خیال ہے۔

کوچہ اور دشت میں بھی ایک روایتی تضاد ہے مگر دراز زلف ایک ویسی ہی وحشت کا سامنا کرنے کے مترادف بھی ہے جو صحرا میں ہو سکتی ہے یا شاید اس سے بھی شدید۔ زلف محبوب کو قید کرنے کے لئے زنجیر کا معنی بھی رکھتی ہے۔ غالب کا زلف کو سر کرنے کا معرکہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر زلف ظلمت (یا

محمد علیم زبیر

کم از کم اندھیرے) کی علامت بھی ہے۔
ان دراز زلفوں والی بستی میں رہ کر کرنا کیا ہے، یہ ہم ذرا آگے چل کر دیکھتے ہیں

"رچائیں گے" یا "پھریں گے"

رچاؤ ایک گہری اور مرتکز توجہ ہے۔ رچانے میں ایک استقلال، ایک دوام ہے۔ رچانا ایک جشن کی صورت بھی ہے۔ پھرنے سے کسی ایک خاص مقصد کے حصول کی کوشش کا خیال فوراً ذہن میں نہیں آتا۔ پھرنے میں ایک بے ثباتی اور بے چینی سی ہے۔ اگر پھرنے کو طواف بھی مان لیا جائے تو مرکز تو کوچۂ جاناں ہی رہے گا۔

"جنوں" اور "پریشاں"

جنوں کے معنی صرف دیوانگی نہیں، بے حد جذبہ، اشتیاق (جو خبط کی حد تک طاری ہو جائے) بھی اس کے نہ صرف مستعمل بلکہ معروف معنی ہیں۔ جبکہ پریشانی نہ صرف بکھرے رہنے کی بات ہے بلکہ اس میں اضطراب، بربادی اور مصیبت بھی شامل ہیں۔

اب موازنے کی ان کیفیات کو سامنے رکھتے ہیں اور شعر کی مکمل تعبیر کی کچھ صورتیں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال سادہ الفاظ میں اس بیان کے ساتھ ساتھ ہم معانی کی ان گہرائیوں اور شدت کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے کہ جن کی کچھ جھلک ہم نے اوپر کی سطروں میں دیکھی ہے۔

۱۔ ہم مصیبت سے گھبرا کر بھاگ جانے والے نہیں بلکہ حالات کا سامنا کرنے والے ہیں۔ دشت و صحرا میں دامن چاک کرنے کی جو آزادی اور سہولت حاصل ہے، وہ ہمیں گوارا نہیں۔

۲۔ مشکل حالات ہمیں ڈراتے نہیں بلکہ ہم تو بصد شوق ان کا سامنا کرتے ہیں بلکہ یہ ہمارے لیے باعث لطف ہے۔

۳۔ ہم اپنے مصائب کی تشہیر نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ جیتے ہیں اور ان میں رہ کر اپنی اور ان کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔

۴۔ جو لوگ ظلم و ستم کے ذمہ دار ہیں، ان کے مرکز میں رہ کر ان کا سامنا کرتے ہیں نہ کہ ادھر ادھر جا کر شور مچاتے پھریں۔

۵۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ غیر متعلق مقامات پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اظہار محبت یا عرضِ حال ادھر کرتے ہیں جدھر شنوائی ممکن ہے۔

اس بات کا تو امکان ہے کہ میری یہ سب تفہیم غلط ہو مگر یہ بات سو فیصد یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ نامکمل ہے۔ آپ اس زیادہ اور بہتر طریقے سے اس شعر کو سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں۔ مگر اس ساری کاوش کا اصل مقصد تو شعر کا لطف اٹھانا ہے اور وہ بہرحال شعر پڑھنے میں ہی ہے۔ سو آخر میں دوبارہ پڑھیے:

کوچۂ زلفِ درازاں میں رچائیں گے جنوں
دشت و صحرا میں پھریں گے نہ پریشاں اب کے

☆☆☆☆☆

امتیاز نامہ از امتیاز گلیانوی کا تجزیاتی مطالعہ

سوانح عمری کی روایت اردو زبان میں ایک مضبوط اور توانا روایت مانی جاتی ہے۔ اہلِ فکر و نظر کا خیال یہ بھی ہے کہ سوانح عمری کی روایت اپنی ادبیت اور کے ساتھ ساتھ نفسیاتی حوالہ رکھنے کے سبب قارئین میں زیادہ مقبولیت کی حامل ہے۔ سوانح عمری کے حوالے سے فنی مباحث بھی خاصے دلچسپ اور لائق توجہ ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ سوانح عمریاں لکھنے والوں نے ان شرائط کا اہتمام بھی کیا ہے اور ان سے مکمل انحراف بھی کیا ہے، بالکل اس طرح جس طرح ہر انسان کی زندگی اور اس کا نظریہ حیات مختلف ہے اسی طرح ہر لکھنے والے کی سوانح کا انداز اور اسلوب بھی الگ ملتا ہے۔ خودنوشت کی کہانی یوں ہے کہ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اور اس کے پاس اس کی زندگی میں ایسا بہت کچھ ہوا جس نے اس کی ذات اور اس کی فکر کو متاثر کیا تو وہ خودنوشت لکھنے کا فیصلہ کرتا ہے اور یوں یہ صنف کسی ایک فرد کی مکمل کہانی لے

عادل سعید قریشی

کر آگے چلتی ہے۔ یہاں یہ حقیقت لائق لحاظ ہے سوانح عمری لکھنا گویا پل صراط پر چلنا ہے، زندگی سچ اور جھوٹ، حقائق اور اوہام کا مجموعہ ہوتی ہے اس لیے اس کا لکھنا ایک مشکل اور کٹھن کام ہے، کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا یہ ایک ایسا سوال نامہ ہے کہ جس کے لیے دلیری، حوصلہ اور خود اعتمادی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ممتاز مفتی سے کسی نے کہا تھا کہ آپ نے چوک میں بیٹھ کر کپڑے دھوئے ہیں اور پردہ نشینوں کو بے پردہ کر دیا ہے، جوش کی یادوں کی بارات کسے نہ یاد ہوگی، اسی طرح شہاب نامہ بھی خود نوشت ہے جو ایک شاندار تخلیق تو ہے لیکن سوانح عمری کی مکمل شرائط پوری نہیں کرتی۔ یہ کتاب نامہ، تین ہجرتوں کی داستان ہے۔ اس کی کہانی کی ندرتا اور روانی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ نامہ کی تین خوبیاں ایسی ہیں جو اس کو اردو کے ادب عالیہ میں جگہ دینے کی ضامن بن سکتی ہیں۔

۱۔ اس سوانح عمری کی سلاست اور روانی

۲۔ دلچسپ واقعات کا ادبی انداز میں بیان (قصہ گوئی)

۳۔ اختصار مع جامعیت

اہل فن کا معلوم نہیں لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ تمام اصناف نثر میں جس صنف کی اثر اندازی کی صلاحیت قدرے کم ہے وہ خود نوشت ہی ہے، ایسا شاید اس لیے ہے کہ لکھنے والے کی اپنی کہانی ہوتی ہے اور اس کہانی میں اس کے لیے واقعات، حادثات اور سانحات کا چناؤ کرنا دقت طلب بھی ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ کسی اور سے صلاح بھی نہیں لے سکتا اور خود اس کے لیے بھی یہ بات خاصی گنجلک ہوتی ہے کہ کون کون سے ایسے واقعات، حادثات اور سانحات تھے جن کے زیر اثر اس کی اپنی نفسیات تشکیل پائیں اور وہ کیا ماحول تھا کہ جس نے اس فرد واحد نظریہ حیات اور اس کی فکری انداز کی ترتیب میں حصہ لیا۔ سوانح نگار کی اپنی ذہنی بلوغت اور فکری بالیدگی کے سوا ایسا کوئی پیمانہ ممکن ہی نہیں جو اس کو اپنی خود نوشت کو معروضیت سے لکھنے میں مدد دے اور وہ اپنی سوانح کو حق و سچ کے تمام پیمانوں پر پورے اتار سکے۔ زندگی ایک ایسی بھارت ہے کہ جس کو بوجھ لینا ضروری نہیں بلکہ بعض اوقات نہ بوجھنا زیادہ تاثیر اور تاثر کا باعث بنتا ہے۔ اپنے موضوع کی طرف گریز کرنے میں

کوئی شے بھی مانع نہیں ہے لیکن مجھے نامے کا تجزیاتی مطالعہ مقصود ہے لہٰذا میں اس کے موضوع اور اس کے عمومی اسلوب پر یوں کہوں گا کہ نامہ ایک ایسی دستاویز ہے جس کو لکھنے والے نے نہایت اخلاص اور محبت سے لکھا۔ کسی نے کہا تھا کہ آپ بیتی لکھنے والا تب لکھتا ہے کہ جب وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی زندگی کا معاملہ اس لائق ہے کہ اس کو عوام پڑھیں اور حظ اٹھائیں۔ گلیانوی لکھتے ہیں:

''میں نے یہ کتاب صرف اور صرف اس لیے لکھی ہے کہ شاید کوئی ''ایک شخص'' ہی میری داستان حیات سے سبق سیکھ کر اپنی زندگی آسان بنالے تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہوگیا۔'' (ص ۱۵)

یہی اس کتاب کا حسن ہے کہ گلیانوی نے اپنی اس کتاب کو ایسے لکھا کہ اس کتاب کا ہیرو عام آدمی کے لبادے میں خاص انسان بن کر سامنے آتا ہے جس نے زندگی کو ایک خاص طرز میں جیا اور پھر اپنا احوال اس نامے میں درج کیا۔

جہاں تک اس کتاب کے تجزیاتی مطالعے کا تعلق ہے تو اس کتاب میں مصنف نے ایسی لفظیات کو اپنے لیے چنا ہے جو کہ اپنے قاری کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہے، یہاں یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ یہ کیسے متعین کیا جاسکتا ہے کہ گلیانوی کے قاری کی ذہنی سطح کیا ہوگی کہ جس کا ادراک انہیں تھا اس کا جواب خود انہی کی زبانی سنیں:

''لکھنے کے حوالے سے ایک اہم بات عرض کرتا چلوں کہ ضروری نہیں کہ ہر لکھنے والا لفظ پڑھنے والے کے مطابق ہو۔ لکھنے والا اپنی کیفیت میں ہوتا ہے جب کہ پڑھنے والا اپنی کیفیت میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دونوں یکساں کیفیات میں ہوتے ہیں تب قاری کو لگتا ہے کہ لکھنے والے نے ایک ایک لفظ میرے لیے ہی لکھا ہے۔ کتابیں بھی روحوں کی طرح ہوتی ہیں کچھ سے افراد آپ کی موافقت ہو جاتی ہے اور کچھ سے خواہ مخواہ مخاصمت۔'' (ص ۱۵)

گلیانوی کے اس عقدہ کشائی کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ وہ اپنے قاری کی ذہنی سطح اور فکری اپج سے واقف و آگاہ ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی کتاب کو ایک ایسے قاری کے لیے لکھا جس کی علمیت اور فہم و ذکا کا ان کو علم ہے۔ بالفاظ دیگر ایسے تخلیق کار کو قاری دوست تخلیق کار

کہتے ہیں۔ ایسے تخلیق کار کے لیے پھر اپنی تخلیق کے لیے لفظیات کا کی تلاش خاصا دقت طلب ہوگا لیکن کا مزاج ایسا ہے کہ ان کو سلاست اور سادہ بیانی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ نامہ میں قاری کو سادہ بیانی اور روزمرہ سے قریب زبان یقیناً متاثر کرے گی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ زبان ہی وہی سطح ہے جہاں قاری اور مصنف کا اتصال ہوتا ہے، بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ اس سطح پر اگر تفہیم اور اعتماد کا ٹانکا لگ جائے تو خیال کی ثقالت اور بات طوالت بھی بار محسوس نہیں ہوتی ہے اور اس درجے پر لفظیات ہی اپنا جادو دکھا سکتی ہیں، یہی جادو نامے میں لفظیات کی صورت سر چڑھ کر بولتا ہے اور ساری کتاب بالاستعیاب اس حوالے سے معیار پر پورا اترتی ہے۔ نامہ کا یہ ہے کہ گلیانوی نے اس کتاب کو سادہ اور روزمرہ اردو میں لکھا اور ان کے محاورے پر ان کی مادری زبان جو کہ پوٹھواری ہے اس کا اثر بھی واضح دکھائی دیتا ہے۔ اردو میں انھوں نے پوٹھواری یا پنجابی کی نحویاتی صورت کو بھی بلا تکلف برتا ہے اور یہ بات کوئی ایسی قابل گرفت بھی نہیں۔ مثلاً

ا۔ لیکن تھا تو ایک عام انسان ہی کمزوریوں اور خامیوں کا مجموعہ ایک عام انسان۔

ب۔ ویسے ہی شغل میلے میں، میں نے اسٹوڈنٹس کے کوٹے میں فارم بھر کر گاڑی لینے کے لیے درخواست دے دی۔

ج۔ میرا بیٹا بہت زیادہ فرمان بردار ہے۔

د۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا کہ باقیوں کا تو پتا نہیں مگر مجھے اپنی مونچھیں بہت عزیز ہیں۔

ہ۔ اور وہ محاورہ بھی آپ نے سنا ہی ہوگا ''مچھ نہیں تے کچھ نہیں۔''

و۔ حالانکہ اتنے دنوں میں کسی بندے کو اپنے گھر سے ٹرین اسٹیشن تک کا راستہ بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آتا اور اوپر سے اگر آپ کو مقامی لوگوں کی زبان بھی نہیں آتی تو پھر گویا آپ گونگے ہی ہیں۔

الفاظ کا یہ دروبست ان کی مادری زبان کا ہے۔ اس طرح ان کی اس کتاب میں بعض کہانیاں ان کی مکالماتی زبان کی لذت لی ہوئی ہیں۔

نامہ ایک دلچسپ، رنگین، پُر رونق اور تجسس سے بھری روداد ہے جس کو لکھنے والے نے

دل سے لکھا اور پڑھنے والے بھی دل سے یعنی شوق سے پڑھیں گے۔ مصنف نے کسی مقام پر بھی اپنے قاری پر اپنی گرفت کو کمزور نہیں پڑنے دیا، واقعات کے بیان اور جذبات نگاری کے ساتھ زندگی میں ملنے والے کرداروں کی کردار نگاری کے ساتھ بھی انصاف کیا اور یہ سارا کمال فن مصنف کے زبان دانی کا ثبوت ہے۔ لفظ سے تخلیق کار کا رشتہ اس قدر مضبوط اور توانا دکھائی دے رہا ہے کہ لگتا نہیں کہ مصنف نے اسلوبیات اصولوں کو کہ جن کا مقصد تحریر کے حسن اور اثر کو بڑھانا ہوتا ہے اس کے لیے محنت اور الگ سے کاوش کی ہوگی۔ یہاں یہ اعتراف میری اس بات تقویت دے گا کہ مصنف نے ''عام آدمی کی کہانی'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی سوانح حالات کو ۳۸۰۰ صفحات سے کم کر کے ۴۶۲ کیا لہٰذا اگر قارئین کو اس آپ بیتی میں کوئی کمی محسوس ہو تو پھر اس کی وجہ اس داستان کو کم کرنے کی سعی ہوگی لیکن میں ذمہ داری سے عرض کر دوں کہ مجھے اس کتاب میں ایسی کوئی بے ربطگی اور خلل نہیں دکھائی دیا۔

نامہ آپ بیتی ہونے کے سبب مختلف موضوعات اور عنوانات کا خاص تنوع رکھتا ہے لیکن گلیانوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر ہر موضوع کو بات چیت کے انداز میں لکھ ڈالا ہے۔ پڑھنے والا ایک دفعہ شروع کرتا ہے تو پھر گلیانوی کے ساتھ وہ بھی وہیں وہیں پھرتا ہے کہ جہاں جہاں انھوں نے سفر کیا، جہاں جہاں ان کی زندگی بسر ہوئی۔ نے اپنی پیدائش، ابتدائی تعلیم، خاندان اور خاندانی وجاہت، گاوں، مری کینٹ، تعلیمی سفر، کالج کی زندگی، زندگی کے خواب، خواب کا تعاقب، علم و آگاہی، عرفان و ادراک، پاکستان کی حب، سیر و سیاحت، اپنے عہد کا سماجی اور ثقافتی منظر نامہ، دین اسلام کی طرف رجحان، عشقِ رسولؐ، زندگی کے دلچسپ لوگوں اور متاثر کرنے والے واقعات اور پُرمسرت موقعوں کا ذکر، غرض یہ ایک دلچسپ اور جاذب دستاویز ہے جس میں ایک آپ بیتی کے تمام اجزا موجود ہیں۔ یہ نامہ از گلیانوی کی کتاب اردو کے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ مانا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

امتیاز نامہ یا ہدایت نامہ

میں برطانیہ کے شہر سویڈن میں مقیم ہوں۔ چند ماہ قبل یہاں مقامی مسجد اور کمیونٹی سنٹر کی انتظامیہ نے اعلان کیا کہ آنے والے اتوار کو ایک پاکستانی مصنف کی کتاب کی تقریب رونمائی ہو رہی ہے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی کیونکہ ''بے ادب'' میں گزشتہ چالیس برس میں یہ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ تھا کہ مصنف گلیانوی صاحب نہ صرف سویڈن ہی کے مقیم ہیں بلکہ پاکستان میں ان کا تعلق اسی علاقہ پوٹھوہار سے ہے جہاں میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

نامہ کی تقریب رونمائی میں مجھے پہلی مرتبہ گلیانوی صاحب کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا ان کی تقریر کے چند پہلے ہی جملوں میں سمجھ لیا کہ یہ صاحب اعلیٰ کردار کو اُجاگر کرنے والے اور دلوں کو ملانے والوں سے ہیں۔ خوش قسمتی سے نامہ کی ایک دستخط شدہ کاپی مجھے بھی حاصل ہوئی۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ اردو ادب سے میرا کوئی گہرا تعلق نہیں ہے آخری اردو کی کتاب جو میں نے مکمل کی وہ کہیں برس پہلے ''شہاب نامہ'' تھی لیکن جب میں نے نامہ پڑھنی شروع کی تو بس پڑھتا ہی چلا گیا۔

نامہ کی کامیابی کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بہت سہل اور سادہ انداز میں تحریر کی گئی ہے۔ دوسرا اس کا مواد نہایت ماہرانہ انداز میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ ہر حصہ ایک مکمل تجربہ بیان کرتا ہے۔ میرے لیے گلیانوی صاحب کے بچپن کی یادیں بہت دلچسپی کا سبب بنی کیونکہ ان میں مجھے اپنے ماضی کا عکس دکھائی دیا۔ گاؤں کی زندگی اور خصوصاً زراعت سے تعلق رکھنے والے کام کے تذکرے نے بہت سی ایسی چیزیں یاد کروا دیں، جو کہ میں تقریباً کر چکا تھا۔ دراصل نامہ کی خوبی یہی ہے کہ اس نے ایک عہد اور علاقے کی روایات کو محفوظ کر لیا ہے۔

نامہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہماری ان رسومات اور اخلاقی اقدار کو فروغ دیتی ہے جو ہم مغرب میں بسنے والے پاکستانی بھولتے جا رہے ہیں بلکہ پاکستان کے اندر بھی یہ کم ہوتی جا رہی ہیں۔ گلیانوی صاحب کا اپنے خاندان سے لگاؤ، مذہبی اقدار سے محبت کتاب کے ہر حصے میں عیاں

طاہر منیر افضل

ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اس کا ٹائٹل ''ہدایت نامہ'' ہوتا تو بھی درست تھا۔ زندگی گزارنے کے جو لازوال اصول انھوں نے تحریر کیے ہیں وہ ہر سطح کے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ چاہے وہ راولپنڈی کی کچھلی گلی کی مسجد میں ایک بزرگ کی باتیں ہوں یا جہاز میں بیٹھے صوفی کی ہدایات، یہ سب روحانی تربیت کا سبب بنتی ہیں۔

نامہ ان ہجرتوں کی داستان بھی ہے جو ہزاروں بلکہ لاکھوں پاکستانی جوان کر چکے ہیں اور کئی لاکھوں کرنے کی حسرت میں رہتے ہیں - میرے لیے گلیانوی صاحب کی تین ہجرتیں افسوس کا سبب بھی بنیں اور خوشی کا بھی۔ افسوس یہ کہ پاکستان کے پڑھے لکھے بہترین لوگ معاشی تقاضوں کے باعث ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خوشی اس بات کی کہ آجکل کی لفافہ صحافت کے دور میں ایسے بھی بہت سے لوگ موجود ہیں جو ضمیر فروشی کے بجائے اصولوں پر قائم رہتے ہیں اور ان میں سے کچھ پردیس کی سخت دقتیں اُٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ نامہ میں پردیس میں بسنے والے پاکستانیوں کے لیے بہت سبق پوشیدہ ہے مقامی زبان سیکھنے کی اہمیت، دوسروں کی مدد کا جذبہ، سماجی اور سیاسی کام میں شرکت، آگے بڑھنے کی تمنا، مقامی لوگوں کو اپنا نظریہ سمجھانا اور نسل پرستوں سے بہادری سے مقابلہ کرنا یہ سب ہمارے مغرب میں بسنے اور پنپنے کے لیے ضروری ہے۔

گلیانوی صاحب سے میری دوسری ملاقات عمران خان کینسر چیرٹی کی ایک تقریب کے وقت لندن میں ہوئی۔ اس وقت تک میں نامہ پڑھ چکا تھا مجھے ایسا لگا کہ میں تو انھیں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں لیکن وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس عدم توازن کو درست کرنے کے لیے میں نے انھیں فیملی کے ساتھ گھر آنے کی دعوت دی، جو انھوں نے فراخ دلی سے قبول کر لی۔ اس طرح ان کے بچوں اور اہلیہ سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ماشاء اللہ ان کے بیٹے بہت ذہین اور محنتی ہیں انگریزی کہاوت ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ گلیانوی صاحب کی فیملی پر صادق آتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ گلیانوی صاحب جیسے مصنف میرے شہر میں بستے ہیں اور ہمیں ان سے ملنے اور اظہار خیال کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں مزید بلندیاں عطا فرمائے اور بچوں کی تعلیم کے لیے جو ہجرت انھوں نے اٹلی سے انگلینڈ کی ہے اس میں کامیابی ہو۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

ادب سرائے کے مشاعرے کچھ یادیں کچھ باتیں

ہم نے جب آنکھ کھولی تو گھر میں علمی، ادبی، مذہبی ماحول پایا۔ جس میں خاص طور پر مشاعروں کو بہت اہمیت حاصل رہی۔

ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ جس میں ملک عزیز سے مقامی و غیر مقامی شعرا شرکت کرتے تھے۔

اس وقت ساہیوال میں مل بیٹھنے کے مواقع بہت کم تھے۔ جہاں لوگ ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر شام کو اپنے کتھارسس کے لیے جمع ہو سکیں تو ادب سرائے اپنے شروعاتی وقت کی وہ واحد فعال تنظیم تھی جس نے لوگوں کو مل بیٹھنے، شاعری سنانے، تنقید و تحقیق کرنے، قہقہہ لگانے کے پورے پورے مواقع فراہم کیے۔

ادب سرائے کے مشاعرے خالصتاً فرشی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ہمارا ایک کنال کا گھر تھا جس کا ڈرائنگ روم بہت بڑا تھا۔ اس فرشی مشاعرے کا اہتمام کچھ منفرد انداز میں ہوتا تھا۔ جس میں فرشی چادریں الگ تھیں۔ جو صرف مشاعرے کے لیے بچھائی جاتیں - علاوہ ازیں گاؤ تکیے مشاعرے کی زینت بڑھانے کے لیے الگ سے رکھے جاتے تھے۔ جن کا استعمال بھی صرف مشاعرے کے لیے ہی ہوتا تھا۔ مشاعرے کے لیے برتنوں کا سیٹ بھی الگ تھا۔ جو بعد از مشاعرہ دھل دھلا کر سپرد ازشوکیس کر دیا جاتا۔

ادب سرائے کے مشاعروں کا ماحول حقیقتاً سچائی پر مبنی تھا۔ جہاں مختلف طبقہ فکر کے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کی آپس میں چپقلش مشہور

سیدہ آمنہ ریاض

تھی۔ابا جی کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مشاعرے میں موجود ہوتے تھے۔ مشاعرے میں امیری غریبی، شہرت گمنامی، بڑے چھوٹے کے فرق سے بالاتر ہو کر سب کو مدعو کیا جاتا۔ہاں ایک چیز جس کا خاص خیال رکھا جاتا وہ معیار تھا جس پر کبھی سمجھوتہ نہ کیا جاتا۔

جس دن مشاعرہ ہونا ہوتا تھا اس دن پورے گھر میں عید کا سا سماں ہوتا۔پورے گھر کی گرینڈ صفائی کروائی جاتی۔ تین چار کام والیاں والدہ (مرحومہ) کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹانے موجود ہوتیں۔ کوئی لہسن پیاز بنا رہا ہوتا تو کوئی کھیر میں چمچ چلا رہا ہوتا۔ مجھے یاد ہے محلے کے چند من چلے نوجوان بھی ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش کے لیے چلے آتے۔ کوئی چادریں بچھا رہا ہوتا، کوئی میز گھسیٹ رہا ہوتا، کوئی برتن لگا رہا ہوتا تو کوئی پانی کے کولر بھر رہا ہوتا۔

میں اس دن فون سنتے تھکتی نہ تھی۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجتی اور میں لپک کر فون اٹھاتی۔ دوسری جانب کوئی شاعر ہوتا جو مشاعرے کے وقت اور رہائش گاہ سے متعلق سوال پوچھتا اور میں لہک لہک کر ہیروئن بن بن کر ان سوالات کے جواب دینا اپنا اولین فرض سمجھتی تھی۔ سچ میں یہ ایکٹیویٹی کرتے ہوئے مجھے بہت مزہ آتا تھا۔

میں غالباً اس وقت تیسری یا چوتھی جماعت کی طالبہ تھی جو پورے سکول میں مشاعرے والے دن اتراتی پھرتی۔ میری سہیلیاں حیرت سے مشاعرے کے قصے سنا کرتی تھیں۔ کیونکہ ان کو اس طرح شوخیاں مارنے کے مواقع بالکل بھی میسر نہ تھے۔

بعد از نماز مغرب جب مشاعرہ شروع ہوتا تو میں اپنی چھوٹی سی ڈائری اٹھا کر ڈرائنگ روم سے ملحقہ گلی میں مشاعرہ سننے بیٹھ جاتی۔ جہاں بہت گرمی اور اندھیرا ہوتا تھا۔ لیکن ان سب کی پرواہ کسے تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوف بھی رہتا کہ کہیں ڈرائنگ روم میں لگے پنکھے کی ہوا سے کھڑکی پر لگا پردہ کھسک ہی نہ جائے اور میں کسی کو نظر ہی نہ آجاؤں۔ ایسے اندھیرے میں اگر کوئی چھپکلی یا کاکروچ نظر آجاتا تو میری روح فنا ہو جاتی اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر دوڑ جاتی اور سوچتی کہ مشاعرہ تے اگلے مہینے فیر ہو جائے گا۔ فی الحال اتھوں بچو۔ خیر بہت مشہور شاعروں کو قریب سے دیکھنے اور ان کا کلام۔ سننے کا موقع ملا جن کے نام اگر لکھنے بیٹھوں تو تحریر طول پکڑ لے گی۔

مشاعرے میں دوسرے شہروں سے شعرا کرام بھی شرکت کرتے تھے۔ جن کی رہائش اور قیام و طعام کا بندوبست بھی کیا جاتا تھا۔ جن پر وہ شعرا بہت سہولت محسوس کرتے اور جاتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دیتے۔

پھر رفتہ رفتہ فرشی مشاعرے ختم ہو گئے کیونکہ والدہ کی وفات ہوگئی۔ ان کی وفات کے بعد اتنے بڑے لیول کا پروگرام سنبھالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا مشاعرے اب صوفوں پر ہونے لگے۔ نیچے بیٹھنے کی روایت تقریباً ختم ہوگئی اور لوگوں کی تعداد بھی کم پڑ گئی۔ والدہ کی وفات کے بعد مشاعرے کی وہ خاص چادریں، برتن، گاؤ تکیے سب دے دلا دیئے گئے۔ میری والدہ (مرحومہ) بڑی بھاگوان عورت تھیں۔ ساری زندگی انھوں نے اباجی کے اس شوق کو اپنا فرض اولین بنائے رکھا اور جب تک زندہ رہیں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو لوگوں کے کھانے کا اہتمام کمال ذمہ داری سے کرتی رہی ہیں۔

پچھلے کچھ سالوں سے میں نے ادب سرائے کے مشاعرے سنبھالنے شروع کیے تو مجھے لگ پتے گئے کہ یہ اتنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ اس کو کیوں بلایا؟ اس کو کیوں نہیں بلایا؟ مجھے صدارت نہیں دی؟ اس کو اعزاز کیوں دیا؟ یہ ایسے مسائل تھے جن سے نبرد آزما ہونا بہت مشکل کام تھا۔ کچھ لوگ ناراض بھی ہوئے تو کچھ خوش بھی۔ شروع میں تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ محتاط ہوتی چلی گئی۔ بہت سے موقعوں پر اباجی سے چنگی پلی ڈانٹ بھی پڑتی رہی۔

میں نے یہ چاہا کہ روایات بھی برقرار رہے اور زمانے کے ساتھ بھی چلا جائے ہر معاملے میں اباجی سے مشورے لیے جاتے رہے جن کا سلسلہ الحمدللہ اب تک جاری ہے۔ میں ہمیشہ کہا کرتی ہوں کہ بڑے انسان کی اولاد ہونا بھی آسان کام نہیں ہے۔ لوگ آپ کو اسی انداز سے پرکھتے ہیں۔ خیر میرے بچپن سے جڑی یادوں میں مشاعرہ خاصی اہم یاد ہے۔ اس مشاعرے کے پیچھے اباجی کا پیار، خلوص، وفا، سچائی اور لگن شامل رہی ہے جو وہ کسی صلے کی پرواہ کیے بغیر آج تک لوگوں میں بانٹتے رہے ہیں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اباجی کا سایہ تا قیامت قائم رہے اور ادب سرائے کے مشاعرے ان کی زیر نگرانی منعقد ہوتے رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

جمہوریت کا شاعر محمد مہدی الجواہری

محمد مہدی الجواہری 26 جولائی 1899 میں عراقی شہر نجف میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عبدالحسین جواہری عالم دین، ادیب اور شاعر تھا۔ یہ علمی و ادبی خاندان نجف کے پرانے مکینوں میں سے ایک ہے۔ بچے کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے باپ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی عالم دین بنے۔ اس مقصد کے پیش نظر جواہری کی تعلیم و تربیت خصوصی و منظم طریقے سے کی گئی۔ عربی علوم و فنون سکھائے گئے۔ بچے کو قرآن مجید پڑھایا گیا مگر حفظ نہیں کرایا گیا۔ روزانہ اس کو نہج البلاغہ کا ایک خطبہ اور دیوان علیؑ میں سے ایک قصیدہ حفظ کرایا جاتا۔ ہزاروں پرانے اور نئے اشعار بھی حفظ کرائے گئے۔ دس سال کی عمر سے باپ نے اپنے بیٹے کو علماء کا لباس عمامہ اور قباء پہنانی شروع کر دی۔

محمد مہدی الجواہری نے عراق کی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ 1920 میں اس نے عراق پر قابض برطانوی استعمار کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ اس وقت اس کی عمر 20 سال تھی۔ 1946 میں عراق میں جمہوری سرگرمیوں کی اجازت ملی۔ اسی سال وطن پارٹی بنائی گئی۔ اس کے بانی ارکان میں جواہری بھی شامل تھا۔ اس کا ادبی رسالہ ''رائے عامہ'' اس پارٹی کا ترجمان رسالہ مقرر ہوا۔ 1947 میں یہ عراقی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔ 1958 میں عراق کا نام جمہوریہ عراق رکھا گیا۔ اسی موقع پر جواہری کو شاعر جمہوریت کا لقب ملا کیونکہ اس نے عراق میں جمہوری عمل کے لیے بہت جدوجہد کی۔

محمد مہدی الجواہری عراقی صحافت میں ایک نمایاں صحافی کے طور پر مشہور ہوئے۔ 1959 میں عراق کی تاریخ میں پہلی بار صحافیوں کی تنظیم کے صدر منتخب ہوئے۔ 1959 سے 1980 تک انجمن عراقی مصنفین کے کئی بار صدر رہے۔ انھوں نے تین ادبی رسالے نکالے مگر تینوں کی منزل پابندی تھی۔ جواہری نے ادبی رسالہ فرات جاری کیا جس کو حکومت نے بند کر دیا۔ دوبارہ یہ رسالہ جاری نہ ہو سکا۔ اس سبب اس نے بغداد اور بصرہ کے ہائی سکولوں میں عملی طور پر پڑھانا شروع کر دیا۔ 1936 میں اس نے اپنا رسالہ انقلاب جاری کیا۔ 3 ماہ کے بعد حکومت نے اس کو

مترجم: محمد احمد

بھی بند کر دیا۔ بعد میں یہ رسالہ ''رائے عامہ'' کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے میں بھی ایسے مضامین ہوتے جو اس کی بندش کا سبب بنے۔ حکومت عراق نے جواہری کو اس رسالے میں سیاست پر لکھنے سے منع کیا مگر یہ باز نہ آیا۔ نتیجتاً یہ رسالہ بھی بند کر دیا گیا اور اس کو 3 ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔

محمد مہدی الجواہری اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اپنے وطن سے دور رہے۔ 1949 میں انھوں نے پولینڈ کا سفر کیا۔ یہاں بین الاقوامی امن کانفرنس عربوں کی طرف سے واحد مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ 1956 میں شام کا دورہ کیا۔ ڈیڑھ سال یہاں قیام کیا۔ یہاں اپنی شاعری بھی سنائی۔ 1961 میں عراق چھوڑ کر لبنان آ بسے۔ یہاں سات سال مقیم رہے۔ یہیں اُن کا شعری مجموعہ ''پردیس کی ڈاک'' 1965 میں چھپا۔ 1968 میں عراقی حکومت کی دعوت پر عراق آ گئے۔ ان کو عراقی شہریت پھر سے مل گئی۔ 1973 میں تونس میں منعقدہ ادبی کانفرنس میں بطور عراقی نمائندہ شرکت کی۔ مصر اور مراکش کے دورے پر بھی گئے۔ کچھ عرصہ کے لیے جواہری ایران ہجرت کر گئے۔ بعد میں واپس عراق آ گئے۔ 1994 میں سعودی عرب کا دورہ کیا۔ دیگر کئی ممالک کی سیر و سیاحت بھی کی۔ 1980 میں صدام حسین کے دور حکومت میں جواہری نے عراق چھوڑ دیا۔ دوبارہ عراق نہ پلٹے۔ شام کے دارالحکومت دمشق میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں ان کو زیادہ عزت و احترام ملا۔ شامی حکومت نے ایک گھر، ایک کار و دیگر سہولیات مہیا کیں۔ شام کے صدر حافظ الاسد کی شان میں انھوں نے ایک قصیدہ کہا جس کا عنوان ہے، ''سلام اے شیر''۔ اردن کے بادشاہ حسین بن طلال کی مدح قصیدہ کہا جس کا عنوان ہے۔ ''میرے آقا میرا منہ مکمل کیجیے''۔ شام کے دارالحکومت دمشق کے وصف میں ایک قصیدہ کہا، جس کا عنوان ہے، ''دمشق عظمت کی پیشانی ہے''۔ 1992 میں شارجہ ٹی وی کو انٹرویو دیا جس میں اپنی شاعری بھی سنائی۔ 27 جولائی 1997 میں دمشق کے ایک ہسپتال میں 98 برس کی عمر میں محمد مہدی الجواہری کی وفات ہوئی۔ انھوں نے اپنے وطن میں دفن ہونے کی وصیت نہ کی۔ دمشق کے قبرستان کے غیر ملکیوں کے احاطے میں اُن کو دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کے کتبے پر لکھا ہے، ''پیارے دجلہ سے دور یہاں محو استراحت''۔

جواہری بغداد کے قادسیہ محلے میں بھی رہے۔ 2018 میں اس گھر کو عجائب گھر اور ثقافتی مرکز بنا دیا گیا اور اس کا نام بیت الجواہری رکھا گیا۔

جواہری نے بچپن سے شاعری شروع کر دی۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں یہ خود اپنے بارے میں

کہتے ہیں کہ میں شاعری کے لیے پیدا کیا گیا۔ اُن کا ابتدائی شعری مجموعہ 1928 میں چھپا، جس کا نام ہے، ''احساس اور جذبہ کے درمیان''۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے عراقی سیاست اور صفحات میں بھرپور حصہ لیا۔ اپنی شاعری میں یہ عوام سے مخاطب ہوئے ہے۔ اُن کی شاعری یورپ کے ادبی و سیاسی افکار سے بھرپور ہے۔ ذاتی تجربات، انقلابی خیالات اور اجتماعی گھٹیا سیاسی افکار بھی اُن کی شاعری میں موجود ہیں۔ اُن کی سب شاعری کلاسیکی اور روایتی ہے۔ عباسی دور کے شاعر متنبی کی زمین پر اُنھوں نے شاعری کی لیکن حکومتی عہدوں کی طلب نہ کی۔ گو کہ اس کے دور میں آزاد عربی شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن جواہری نے آزاد شاعری نہ کی۔

عراق میں ایک سیاسی مظاہرے میں اُن کے بھائی کو گولی لگی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ گولی کے زخم سے وفات پا گیا۔ اس پر جواہری نے اپنے بھائی کے دو الگ الگ مرثیے لکھے۔ ایک کا عنوان ہے، ''میرا بھائی جعفر''، دوسرے کا عنوان ہے، ''شہید کا دن'' یہ دونوں مرثیے جدید اشتعال آمیز شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی بیوی ام فرات کا بھی مرثیہ لکھا۔ تین جلدوں پر مشتمل دیوان الجواہری 1935، 1949، 1953 اور اس کے بعد کئی بار چھپ چکا ہے۔

عرب شاعر و ناقد فالح جیہ کہلانی اپنی کتاب ''مختصر عربی شاعری اور معاصر شعراء'' میں لکھتا ہے کہ متنبّی کے بعد جواہری کی طرح کا کوئی اور شاعر نہیں آیا۔ یہ دور جدید کا متنبی ہے۔ گو کہ جواہری کے دور میں پورا عرب خطہ شاعروں سے بھرا ہوا تھا لیکن اپنے اسلوب اور شعر کی پختگی کے سبب یہ اپنے دور میں عربوں کا سب سے بڑا شاعر کہلایا۔

محمد مہدی الجواہری کا حضرت امام حسینؓ بن علیؓ کی مدح میں کہا گیا ایک قصیدہ، حضرت امام حسینؓ کے روضہ پہ آب زر سے لکھا گیا ہے، اس میں سے مطلع سمیت چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نثار میں آپ کی قیام گاہ کے بستر پر
یہ آرام گاہ شاندار نور سے منور ہے

یہ قیام گاہ جنتوں کی خشبوؤں سے معطر ہے اور راحت سے معمور ہے
یہاں سے جنت کی خوشبوئیں آگے بکھر رہی ہیں

گویا کہ مزار کے پیچھے ہاتھ ہے
جو سرخ ہے اور اس کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں

وہ ہاتھ عاجزی سے دنیا کی طرف بڑھتا ہے
اور اہل مشرق ظلم سے لبریز ہیں

یہ ہاتھ گھنے جنگلوں میں تہہ در تہہ پھیل گیا ہے
گنہگار پر بھی اور خوشحال پر بھی

☆☆☆☆☆

مشاعرے کی روایت اور سطحی شاعری کا رجحان (مباحثہ)

فیصل زمان چشتی نے ابتدائی نوٹ پڑھکر بحث کا آغاز کیا۔ اردو زبان وادب کی ترویج وترقی اور فروغ میں شاعری اور مشاعرے کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے، مشاعرے کی روایت سے تہذیب کو مثبت پروان چڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مشاعرے تہذیب وثقافت کے آئینہ دار اور عہد کی تاریخ کے مرتب کنندہ ہوتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں مشاعرے عام لوگوں کو میسر نہ تھے بلکہ بادشاہوں اور نوابوں کے لیے خاص تھے اور شاعری کے مخصوص مضامین تھے پھر جس طرح شاعری میں عوام اور سماج کے مسائل آنا شروع ہوئے۔ معاشرے سے ادب اور شاعری کی جڑت مضبوط ہوتی چلی گئی اردو ممتاز شاعر خواجہ میر درد آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ہر مہینے کی آخری تاریخوں کو عوامی مشاعرہ کروایا کرتے تھے ایک مشاعرے میں مغل فرمانروا شاہ عالم آفتاب ثانی بھی شریک تھے۔ پاؤں میں درد کی وجہ سے بادشاہ نے پاؤں پھیلا دیئے خواجہ میر درد کو یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ بول اُٹھے کہ بادشاہ سلامت اگر پاؤں میں درد تھا تو مشاعرے میں شرکت کی کیا ضرورت تھی۔ اس ایک واقعہ سے مشاعرہ میں آداب محفل کو کیا اہمیت حاصل ہے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ریڈیو ٹیلی وژن اور علمی وثقافتی اداروں بشمول حلقہ ارباب ذوق نے مشاعرے کی روایت کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ مشاعرے عوام کے اندر ادبی ذوق بیدار کرتے ہیں۔ اس خوبصورت روایت کی پاسداری کی جاتی رہے تو آج کا نوجوان فہم و ادراک کا مالک ہو گا۔ غیر معیاری یا سطحی شاعری سے مراد ایسی

فیصل زمان چشتی

شاعری جس میں سوچ وفکر اور مقصدیت کا فقدان ہو، جس شاعری میں شاعر موجود نہ ہو اس کا معاشرہ موجود نہ ہو اس کا سماج نہ آئے اپنا اور معاشرے کا درد نہ بتا سکے اور فشارِ خون کا باعث نہ ہو وہ شاعری نہیں بلکہ وقت کا ضائع ہے۔ سیکھنے سکھانے کا عمل معدوم ہوتا جا رہا ہے راتوں رات مشہور ہونے کی ہوس نے بہت سے بگاڑ پیدا کر دیئے ہیں۔ جبکہ شاعری پوری عمر مانگتی ہے ریاض مانگتی ہے، رت جگے مانگتی ہے۔ خونِ جگر مانگتی ہے۔ شاعر اپنے قاری کی فکری رہنمائی کرتا ہے اور اساتذہ کو اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ سستی شہرت اور لالچ انسان کو اس کی منزلوں کو کوسوں دور لے جاتی ہے۔ ادبی مافیاز نے پوری ادبی فضا کو کنٹرول کر رکھا ہے۔ مشاعروں اور ٹی وی سے لے کر کانفرنسز تک بیرونی اقتدار اعلیٰ کے ایوانوں تک اعلیٰ عہدوں سے لے کر اشرافیہ اور انتظامیہ سے تعلقات تک ان کا مکمل قبضہ ہے۔ یہ وہ ریڈ زون ہے جس میں کسی کو پَر مارنے کی جرأت نہیں ہے پچھلی کئی دہائیوں سے ہر چیز مکمل ان کے قبضے میں ہے ان سے سب کچھ واپس لینا چیل کے گھونسلے سے ماس اٹھانے کے مترادف ہے غیر حقیقی شاعری اور شاعر و شاعرات میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے ہر سال ہزاروں کتابیں چھپنے کے باوجود ایک شعر نکل نہیں پاتا۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی مافیاز جو زبانوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور اچھے شاعروں سے خائف ہو کر ان کو سائیڈ لائن پر لگا کر سوشل میڈیا کے ذریعے لچر پن اور بے ہودگی کو فروغ دینے کے لیے غیر سنجیدہ شعرا اور شاعری کو پرموٹ کر رہے ہیں انھیں کمرشل شاعروں میں بلا کر بڑا شاعر بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے جینوئین اور سنجیدہ ادب کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سنجیدہ شعرا اور اساتذہ کو آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہیے مافیاز کو روکنا چاہیے ورنہ آنے والی نسلیں ان کے وار سے بچ نہیں پائیں گی۔

اس کے بعد فرحت عباس شاہ نے اپنا مقالہ پیش کیا، جس میں بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا تاریخ گواہ ہے کہ مشاعرہ جہاں عمدہ شعرا کے لیے ایک مستند ذریعہ پیشگی اور میدان تقابل رہا ہے وہاں نئے جاندار شعرا کے تعارف کا باعث اور شعری اعلیٰ ذوق سامعین و ناظرین کے ذوق سلیم کی تسکین کا براہ راست وسیلہ بھی بنتا آیا ہے اس کے ساتھ ساتھ حاضرین کی جمالیات

کی تربیت میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے مشاعرہ کے آرگنائزر بہترین شعرا کا انتخاب کر کے اور عمدہ شعرا کی تلاش میں رہتے۔ یہاں تک کہ ایسے بڑے اور مشکل پسند شعرا کو بھی موقع دیا جاتا جنھیں بظاہر ان کے گہری فکری اظہار اور مشکل پیرائے شعر کے باعث مشاعرے کے لیے زیادہ سپوٹ ایبل نہیں سمجھا جاتا تھا پھر نظم گو شعرا کو بھی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت کے طور پر بلایا جاتا رہا ہے۔ اقبال، فیض اور منیر نیازی کی مثال اس ضمن میں دی جا سکتی ہے۔ اس روایت کو خراب کرنے کا عمل کوئی زیادہ پرانا نہیں بلکہ تین چار دہائیاں پہلے جب اخبارات کے ادبی صفحات کے نگرانوں اخباری کالموں کے ذریعے دباؤ کی طاقت حاصل کرنے والے نام نہاد ادیبوں اور ٹی وی ڈرامے لکھنے والے کمتر درجے کے شاعروں نے مشاعروں کو باقاعدہ منافع بخش دھندہ سمجھ کر پوری پلاننگ کے ساتھ ٹھیکیداری شروع کی تو اس روایت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ ماضی قریب میں کچھ ''ایسے شعرا اور آرگنائزر بھی دیکھنے میں آئے جنھوں نے شاعروں کو بزنس کے طور پر اپنایا انھوں نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ پبلک ریلشنگ کی۔ سرکاری افسران سے روابط اور سرکاری افسر شاعروں پر قبضہ کرنے اور ہر طرح کا طریقہ آزما کر مشاعروں پر اجارہ داری قائم کی، جس کے نتیجے میں اچھی شاعری سے حظ اٹھانے کے مقصد پر تماش بینی کی نفسیات غالب آ گئی۔ اور آرگنائزر کے دھڑے وجود میں آ گئے۔ پلاننگ کے تحت اچھے شاعروں کا پتہ صاف کیا جانے لگا اور انھیں فیک شعرا سے replace کیا جانے لگا۔

اچھے شاعروں کی عدم شرکت سے اچھے سامعین کی تعداد کم ہوتی گئی اور ان کی جگہ محض وقت گزاری والے سامعین حاضرین بن گئے، حتیٰ کہ کالج اور یونیورسٹیز کی ادبی سوسائٹیز کے عہدیداران طلباء و طالبات سے مراسم بڑھانے اور ان کی معصومیت بھری ادب دوستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعلیمی اداروں کے مشاعروں پر قبضے کے واقعات سامنے آ گئے۔ پچھلے کچھ سالوں سے غیر ملکی فنڈنگ سے چلنے والی این جی اوز کے ذریعے مخصوص ایجنڈوں کے ذریعے دستور ادب ادیب اور مشاعروں کی روایت کو ایک منظم سازش کے تحت ختم کیا جانے لگا ہے۔ یہ این جی اوز مختلف ویب پورٹلز کے ذریعے ادب کی ترویج کا لیبل لگا کر مشاعرے اور سیمینارز کرواتی ہیں ان

مشاعروں میں بے وزن اور مادر پدر آزاد شاعری کو سوشل میڈیا کے ذریعے کروڑوں روپوں کی کرپشن کروا کر انھیں پاپولر بنایا جاتا ہے۔ دادیں ہاؤ ہو کے علاوہ کچھ نہیں۔ مشاعروں کے ایس او پیز ہوتے ہیں کہ حمد، نعت، منقبت یا تصوف کے موضوعات پر اشعار سنانے کی اجازت نہیں - سنجیدہ معاشرتی معاشی یا اخلاقی موضوعات پر لکھنے پر پابندی ہو گی تاکہ نوجوان نسل کی جمالیات متاثر کر کے ان کے احساسات کو سطحی حسیّت تک محدود کر دیا جائے۔ کولڈ ڈرنگ کمپنی نے ان سے پہلے موسیقی سے بھی یہی سلوک کیا۔ فنونِ لطیفہ سستی اور بے معنی کمرشلائزیشن کے اس رجحان نے آج ہمارے کریئٹو آرٹس خصوصاً شاعری کو آج بے مقصدیت اور بے معنویت کے جس سستے ٹریک پر لا کھڑا کیا ہے اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو انسانی پستی سماجی اور بے ترتیبی میں مزید اضافہ ہوگا - اب انسانوں کو تشخص اور تجریاتی فکر سے محروم کرنے کے لیے ہر طریقہ آزمایا جا رہا ہے۔

اس کے بعد بات کرتے ہوئے علی نواز شاہ نے کہا کہ پرانے دور میں شاعری کی پاپولیرٹی اس وجہ سے تھی کہ مشاعرہ ذوق طبع کا باعث تھا۔ قصہ گوئی اور شاعری میں بہت گہرا رشتہ تھا۔ شاعری دو قسم کی تھی ایک تصوف اور عارفانہ کلام تھا دوسری محبت کی شاعری۔ دونوں مختلف نظریے تھے اور دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کا انداز مختلف تھا ہمارے ہاں اردو اور پنجابی مشاعروں کی روایت موجود ہے جب بڑی ترتیب اور منظم طریقے سے مشاعروں ہوتے تھے۔ پہلے ریڈیو پھر ٹی وی جس نے ان میڈیمز نے مشاعروں کی روایت کو بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھایا ہے - مشاعرے نئے شاعروں کے لیے انرجی اور طاقت کا باعث ہوتے ہیں اور ان کی مزید لکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آجکل مشاعروں اور شاعروں میں سیاست بہت غالب آچکی ہے لیکن پھر بھی شاعری کسی نہ کسی طرح سے پروان چڑھ رہی ہے ہر دور میں جینوئن شعرا موجود رہے جو اس تحریک کو لے کر آگے بڑھتے رہے ہیں ایک باریک بات ہے کہ کیا کوئی ناول نگار یا شاعر پیسے اور تشہیر کے لیے کام کرتا ہے مگر ایک خالص اور جینوئن تخلیق کار ان دونوں چیزوں سے آزاد ہوتا ہے اگر وہ لالچی ہوتا ہے تو الفاظ کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے - ہمارے معاشرے میں اسی لیے شاعروں کا فقدان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے کہ لوگ دوسری طرف چلے گئے ہیں مگر

ڈاکٹر سعادت سعید، فرحت عباس شاہ، منیر نیازی اور اس قبیل کے دوسرے شاعر جینوئن کام کرتے رہے اور انسانیت کے لیے کام کرتے رہے ہیں کیونکہ شاعری پیغمبرانہ وصف ہے۔ ایک وقت تھا جب لوگ بڑے شوق سے کتابیں پڑھتے تھے اب لوگ سہل پسند اور پیسے اور شہرت کے پیچھے پڑھ کر اصل مقصد کو بھول رہے ہیں اُمید کرتا ہوں ہمارے اساتذہ اور سینئرز اس سلسلے میں آگے بڑھ کر اس کے سدباب کے لیے سنجیدہ اقدامات کریں گے۔

اس کے بعد پروفیسر شفیق احمد خان نے کہا کہ اردو زبان کا جب آغاز ہوا تو شاعری ہی بنیادی چیز تھی نثر نہیں تھی اور مشاعرہ کے ذریعے شاعری کی ترسیل کی جاتی تھی۔ پرانے دور میں ادبی تقریبات نواب اور بادشاہ کرواتے تھے۔ شاعروں کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ آج کا معاشرہ پچھلے چالیس یا پچاس سال کا عرصہ ہے اس میں مشاعرہ کو پیسے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا جس سے خرافات اور مسائل پیدا ہوئے۔ ایک ذریعہ تو یہ ہے کہ شاعر اکٹھے ہو گئے اور مشاعرہ برپا ہو جاتا تھا۔ ریڈیو آ گیا تو اس میں شمولیت بڑا کام سمجھا گیا اس کے بعد ٹی وی کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ بتیس سال پہلے ٹی وی پر میرا زیادہ آنا جانا تھا۔ اس دور میں فرحت عباس شاہ کو مشاعرہ کی دعوت دی گئی تو انھوں نے کہا کہ میں ٹی وی پر نہیں پڑھ سکتا مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بیان کرنے کا مقصد ٹی وی کے مشاعروں کی اہمیت بتانا تھا۔ پھر سرکاری مشاعروں کا دور چلا اس میں ٹھیکیدار سسٹم آ گیا اور کافی زیادہ پیسہ اس سے وابستہ ہو گیا۔ سوشل میڈیا کی آمد سے ٹی وی اخبارات اور ریڈیو کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور کرونا کی وجہ سے آن لائن مشاعرہ کی طرح پڑی۔ مشاعرہ میں پہلے اور بعد میں پڑھنے کے کافی مسائل آتے رہے اور ناراضگیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ پھر مشاعرہ کے لیے بیرون ملک نئی منڈیاں تلاش کی گئیں اور روابط بڑھائے گئے اور یہاں تک بڑھائے گئے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بڑے ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر کے ساتھ تقریبات کا سلسلہ بھی چل نکلا، جس میں بڑے بڑے لوگ میدان میں آئے۔ ان سلسلوں نے شاعری کے خدوخال کو معدوم نہیں بلکہ مسخ کیا اور اصل قاری کو شاعری سے متنفر کیا۔ اچھے لکھنے والوں کو اس بات کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اقبالؒ نے آخری عمر میں مشاعرے پڑھنے بند کر دیے تھے۔ چراغ حسن حسرت نے

پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آپ مشاعروں میں نہیں جاتے مشاعروں نے اردو کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے، تو جواب میں انھوں نے کہا کہ اردو کو فائدہ پہنچایا مگر شاعری کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد مکالمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے بات کرتے ہیں۔

تاثیر نقوی نے کہا اساتذہ شاعری سے کمیٹڈ تھے اور نوجوانوں کی تربیت کرتے تھے اور نوجوان ان سے سیکھتے تھے اور ادب و احترام کا رشتہ قائم تھا۔ پرانے زمانے میں بڑے شاعروں کے پوسٹر لگتے تھے کہ آج احسان دانش، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کا مشاعرہ ہے اس پوسٹر سے شاعری کی تحریک جنم لیتی تھی۔ جب سے مشاعروں میں مالی معاملات آئے ہیں اس وقت سے مسائل نے جنم لیا ہے۔ آج کے دور میں سب سے پہلے شاعر اپنے پیسے کے بارے میں پوچھتے ہیں اور گروہ بندیاں بھی نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اساتذہ بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں سے گروہ بنوا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کے نقصانات کے ساتھ ساتھ وہ اچھے شاعروں کو پڑھتا ہے اور فوائد سیکھنے والا سیکھتا بھی ہے۔ مضافات میں اچھی شاعری ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ آگے بڑھ ایک مشن کے تحت سنجیدہ ادب اور شاعری کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے ورنہ مزید خرابی ہوگی۔

مقصود خالق نے کہا کہ ہمارا آرٹ بادشاہت سے جڑا ہوا ہے۔ پہلے بادشاہ قصیدہ گوئی کے لیے شاعر بنتے تھے اور حظ اُٹھاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سماجی مسائل آتے گئے۔ مشاعرے چونکہ ہمارے معاشرے سے جڑے ہوتے ہیں اس لیے اس پر وار کیا گیا۔ شاعری میں ردھم ہوتا ہے جس سے زیادہ لطف آتا ہے اور اس کے ساتھ موسیقی جڑی ہوتی ہے۔ سامراج نے بُرے شاعر اور بُرے موسیقار و گلوکار کو آگے لایا یہ کلچر اور ثقافت جو بری طرح تباہ کر رہے ہیں۔ کوک سٹوڈیو نے بیڑا غرق کیا ہوا ہے۔ 12 شہروں میں فیسٹیول ہوتا ہے جس کا اربوں کا بجٹ ہے۔ بیرون ملک میں شعرا کو بلایا جاتا ہے جو ان کے آنے سے ادھر تقریبات منعقد کرتے ہیں، سینئرز اور سنجیدہ ادبا اور شعرا کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ جہاں تک عوامی مشاعروں کی روایت تھی، وہ اب ختم ہو چکی ہے عوامی مشاعروں میں غیر معیاری شاعری پر اتنی بے عزتی ہوتی ہے کہ وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ ہمارے اساتذہ کو چاہیے کہ انگلی اس کی پکڑیں جس میں سَت موجود ہو۔ ہر ایک کی انگلی نہ پکڑیں۔ ہمیں تربیت

گاہوں کو مضبوط کرنا چاہیے اور ایسے مباحث کا انتظام کرنا چاہیے جس میں جمالیات، عوامی رنگ اور سماجیات اور مفہوم موجود ہو وہ شاعری نہیں ہے بے شک فیض اور ساحر پیدا نہ ہوں ان جیسا بننے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔

علی شاہ نے سوال کیا کہ مقالوں میں انگریزی کے لفظ کیوں زیادہ استعمال ہوتے ہیں آپ لوگوں نے کہا کہ شوق اگر پیسہ بن جائے تو زندگی نعمت بن جاتی ہے لیکن یہاں پر اس پر تنقید ہوئی ہے یہ کیوں ہے۔

صاحب صدارت پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید نے کہا کہ جن شاعروں نے مشاعروں کو کاروبار بنا رکھا ہے وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور پرانے دور میں بھی درباری شاعر تھے اور بڑے جید شعرا کو بھی قصیدہ گوئی کرنا پڑی ابراہیم ذوق تو بادشاہ کا مصاحب تھا اور غالب نے بھی ملکہ وکٹوریہ اور دیگر انگریزوں کے قصائد لکھے اور کئی نوابوں کے بھی قصائد کیونکہ رزق کا معاملہ تھا۔ میر تقی میر، نواب آصف الدولہ کے لشکر میں شامل تھے اور شکار پر نظمیں لکھتے تھے پیٹ بڑے بڑے کام کروا دیتا ہے اس لیے بہت محتاط ہو کر ہمیں بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں رزق کا معاملہ ہے پیٹ تو پالنا ہے۔

شکم کی مار ہے شاعر نہیں مچھندر ہے

.....

ہم مشاعروں سے روزگار حاصل نہیں کر رہے ہیں اس لیے کبھی مشاعروں میں نہ جانے کا افسوس نہیں ہوا لیکن جب بھی مشاعروں میں بلایا گیا تو سب کو پتہ ہے کیا ہوتا ہے اسی لیے خائف رہتے ہیں اسی لیے ذوق کے شاگردوں نے غالب کو داد دینے سے انکار کر دیا تھا گروہ بندی کا سلسلہ چلتا ہے۔ میرے خیال میں اس سب کے باوجود شاعری ترقی کر رہی ہے۔ میں ابھی تک بارہ سو نظم گو شاعر منتخب کر چکا ہوں۔ لیکن یہ سب مشاعروں میں نہیں جاتے۔

ارباب اختیار یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا کلچر مسخ ہو جائے ہم اس سمت نہ جائیں جو ہمیں خودی اور خودمختاری کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ یہ سب کچھ نئی طرز کی غلامی ہے۔ ایسی تعلیم دی جائے کہ یہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہیں عام آدمی کو غور و فکر کے بغیر نالج پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

انگریزوں نے انڈیا میں آکر فارسی زبان کو ختم کیا اردو اور انگریزی کو لائے کیونکہ فارسی ایک ہزار سال سے رائج تھی اور تمام علوم فارسی میں تھے۔ انھوں نے روایات اور کلچر سے الگ کرنا تھا۔ لارڈ میکالے نے

گھر خط لکھا کہ ہم ہندوستان میں ایسا سسٹم لا رہے ہیں کہ اگر کوئی ہندو عیسائی نہیں ہوگا وہ یہاں نہیں رہ سکے گا یہی بات مسلمانوں پر بھی منطبق ہوگی۔ مشاعرے، عرسوں پر درباروں میں اور مجالس میں ہوتے تھے۔ مشاعروں کے ذریعے پیغامات دیئے جاتے تھے۔ جرات نے ایسی رباعی لکھی تھی جو آج بھی ہمارے حالات سے منطبق ہے حالانکہ اس کے بارے میں افواہ پھیلائی گئی کہ یہ رومانوی شاعر ہے۔ ہم نے تحقیق کیے بغیر اس بات پر یقین کر لیا اور اس کے قریب نہ گئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر اپنا رول ادا کرتے رہے ہیں۔ کلچر پر یلغار شروع سے ہوتی رہی ہے۔ انگریز اور مغل بادشاہ بھی تو عوامی آدمی نہ تھے شاعر اس دور میں بھی عوامی بات کرتے تھے، جو ڈائریکٹ بات کرتے تھے سزا پاتے تھے۔ داستان گوئی بڑی تہذیب تھی آج بھی اس کو بحال کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ کیونکہ داستان گو بھی دو باتوں میں بڑی بڑی بات کہہ جاتے تھے۔ پریوں کے قصے جنگلوں کی کہانیاں داستاں کے ذریعے سنی جاتی تھیں اور جو خواہش ویسے پوری نہیں ہو سکتی داستان میں پوری کی جاتی تھی۔ مقصد یہ کہ داستان کہانیاں ہیں لیکن انھی داستانوں نے ہمیں اڑنا سکھایا ہے۔ اڑن کھٹولے سے ہی جہاز وجود میں آئے ہیں۔ جن کے تصور سے آپ 12 گھنٹے میں پوری دنیا گھوم سکتے ہیں۔ نثر اور شاعری میں 100 ignition ہوتی ہے۔ ہمیں سیکھنا ہے اور شاعروں نے سکھایا بھی ہے۔ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے وہ انگریزوں کے دور میں لکھا ہے اس نے ہمیں بتایا کہ انگریزوں کے چنگل سے کیسے نکلنا ہے۔ آج فرحت عباس شاہ کے سامنے سامراج ہے کہ اس سے کیسے بچنا ہے اس سے کیسے نجات حاصل کرنی ہے۔ مشاعرہ ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے بھی چھ شعری مجموعے ہیں جن میں کہیں بھی رجعت پسندی نہیں ہیں۔ پروگریسو سوچ پر کتاب اور ہر لائن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی شعر یا لائن اس سے باہر نہیں ہے وہ اس لیے کہ میں نے پڑھا، سمجھا اور پھر لکھا ہے۔

ہمیں پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے کیونکہ پڑھنے سے شعور آتا ہے اور ہماری نفسیات تبدیل ہوگی تجزیاتی سوچ پیدا ہوگی۔ نئے زاویے سے نظر آنا شروع ہو جائے گا۔

صاحب صدارت کے خطاب کے اختتام کے ساتھ ہی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

☆☆☆☆☆

حیرتیں ختم ہونے والی ہیں

شاعرِ امروز
توقیر احمد

شاہد ماکلی

توقیر احمد کی غزل روزنِ ذات سے نظر آنے والی دُنیا اور اُس دنیا میں پھیلے ہوئے منظروں اور منطقوں کی نقش بند ہے۔ وہ اپنے موضوعات اُس انکشافی دورانیے سے اخذ کرتے ہیں جو منظر اور نگاہ کے لمحہء اتصال سے میسّر آتا ہے۔ داخلیت کی سرشاری اور پرستاری نے ان پر عرفانِ ذات کی کئی منزلیں آسان کر دی ہیں۔ زبان کی سادگی اور پختہ بُنت کاری نے ان کی معنوی ترسیل کو سہل کر دیا ہے۔ وہ مشاہداتی واقعات کے تلخ و شیریں ذائقوں کو جذب کرتے ہیں اور کیفیاتِ قلبی کو تخلیقی سطح پر استوار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اتنی ساری خوبیوں کی موجودگی ان کی غزل میں روشن امکانات کا واضح سراغ دے رہی ہے۔

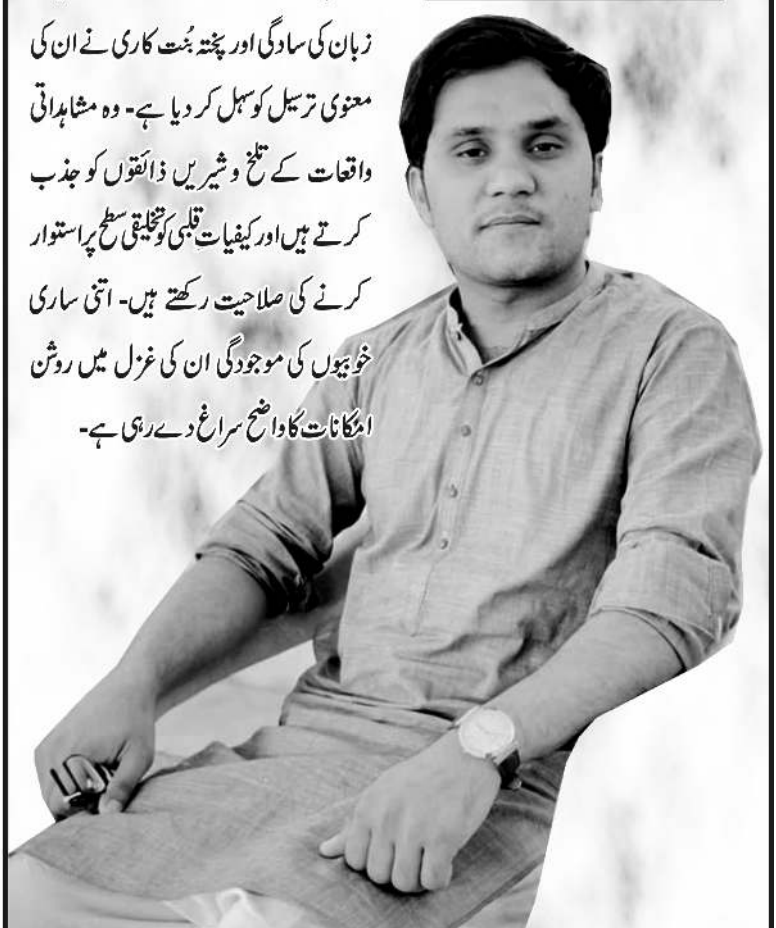

توقیر احمد 26 اپریل 1997 کو منڈی بہاؤالدین میں پیدا ہوئے۔ 2014 سے شعر کہنا آغاز کیا۔ ایم ایس سی میتھ اور ایم اے اردو ہیں۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

تمھارے ہاتھ نہ آئیں تو رنج مت کرنا
ہم اپنے آپ سے آگے نکل گئے ہیں دوست

یہاں پہ روشنی ہونا بہت ہی مشکل ہے
یہاں چراغ نہیں، دل بجھے ہوئے ہیں دوست

کچھ اس طرح سے بھی ہم لوگ رائیگاں گئے ہیں
وہاں پہ جانا نہیں تھا، جہاں جہاں گئے ہیں

قریب ہونے کی خواہش میں کچھ خبر نہ رہی
کہاں سے دور ہوئے جاتے ہیں، کہاں سے قریب

یہ کیسے دکھ ہیں جو رہ گیر سے بندھے ہوئے ہیں
سفر کے زائچے زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں

حجرگی میں نہ اگر کوئی خلل آئے تو دوست!
مجھ کو شکوہ نہیں کوئی تری ہم دوشی سے

ہمارا مسکنِ دنیا میں دل نہیں لگتا
کہ یہ ٹھکانہ ہمیں مستقل نہیں لگتا

خوف رہتا ہے، کھو نہ جائے کہیں
کیسی نعمت ہے دستیابی بھی

وہ سمجھتے ہیں رمز مٹی کی
جو شرارے سے خاک ہو گئے ہیں

حیرتیں ختم ہونے والی ہیں
ہم ہیں مٹھی کو کھولنے والے

باغ کی سیر سے دشت کی سمت جانے کا رستہ نہیں مل رہا
تیری جانب سے ہٹتے ہوئے خود میں آنے کا رستہ نہیں مل رہا

اس نے دریاؤں کو باندھ کر اپنی آنکھوں میں رکھا ہوا ہے
اور دریاؤں میں اس نے رکھے ہوئے ہیں بھنور باندھ کر

دل کی چپ کے سمندر سے اٹھتا ہوا کیا عجب شور ہے
کچھ سنائی نہیں دے رہا اس قدر زیرِ لب شور ہے

اپنے اپنے کنارے پہ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے ہوئے
بیچ میں اک زمانے سے بہتا ہوا بے سبب شور ہے

☆☆☆☆☆

میں نے دیوار نہیں، رستہ بنایا خود کو

شاعرِ امروز

فقیہہ حیدر

شاہد ماکلی

فقیہہ حیدر کی شاعری، شاہراہِ زندگی کی پگڈنڈیوں میں اگنے والے سبزۂ بیگانہ کی طرح ہے۔ ایسی شاعری کو اپنی نمو کے لیے تردّد نہیں کرنا پڑتا؛ ایسی شاعری بارانی موسموں میں گھنی تو اُگتی ہے مگر یہ بادوباراں کی محتاج نہیں ہوتی اور نہ ہی مرطوب و موافق آب و ہوا کی منتظر ہوتی ہے۔ فقیہہ حیدر کی شاعری کو زندگی کا ہر موسم راس ہے اور یہ ہر طرح کے آثار سے اپنے حصے کی جمالیات کشید کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ وہ پورے اخلاص اور بے ساختہ پن کے ساتھ اپنے محسوسات اور کیفیات کی تجسیم کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ابلاغ کا ایسا قرینہ موجود ہے جو اپنی معنوی فریکونسی کو اپنے قاری کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کا کلامیہ کئی غمزدوں کے دل کی آواز بن جاتا ہے۔ فقیہہ حیدر ایک حیران حال اور اپنی دُھن میں سرمست و سرشار رہنے والے لیکھک ہیں۔ اُن کے کیسہء تخلیق سے ہنرمندی کم اور شاعری زیادہ برآمد ہوتی ہے۔

فقیہہ حیدر 28 جنوری 1986 کو حافظ آباد میں پیدا ہوئے۔ پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر کیا۔ 2004 سے شعر کہنا شروع کیا۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

نہ پوچھ، کتنی محبت ہوئی ہے خرچ مری
تمام شہر کو اپنے خلاف کرتے ہوئے

اس لیے چھوڑ دیا بھیس بدلنا میں نے
مجھ کو ہر روپ میں پہچان لیا جاتا ہے

وہ ڈوبنے کی اداکاری کرتے ڈوبا ہے
وگرنہ میں نے مدد کو ضرور جانا تھا

آنے والوں کے لیے تا کہ رکاوٹ نہ بنوں
میں نے دیوار نہیں ، رستہ بنایا خود کو

اس کا مطلب ہے کہ میں اور بھی رو سکتا ہوں
ابھی آواز نہیں بھاری ہوئی ہے میری

اک توازن میں رکھا اپنا اجڑ جانا بھی
اتنا مسمار کیا ، جتنا بنایا خود کو

قریب آ کے ہمیں اور دور جانا تھا
چراغ جلتے ہی آنکھوں سے نور جانا تھا

میں فقط ایک طرف ہو کے اسے دیکھتا ہوں
اور وہ شخص مرے چاروں طرف ہوتا ہے

وگرنہ شہر میں مشہور تھے لطیفے مرے
تو پہلا شخص ہے جس نے مجھے اُداس کیا

جس طرف جاؤ تصادم ہی تصادم ہے یہاں
کوئی ترتیب نہیں رکھی گئی دنیا کی

تو سمندر نہیں ہے ورنہ میں
تیری تہہ میں کہیں پڑا ہوتا

بچھڑتے وقت مڑ کر اس لیے دیکھا نہیں میں نے
کئی منظر نہیں ہوتے دوبارہ دیکھنے والے

میری خاموشی کو ہر شخص نے اپنایا ہے
میرے حصے کا مگر شور نہیں کرتا کوئی

کچھ نہیں بدلا تمہارے بعد بھی
زندگی تصویر تھی ، تصویر ہے

اس قدر بے زبانی ہے در پیش
بولنے کے لیے ترس گئے ہیں

منہ زور ہوا سے ڈر گیا ہے
لگتا ہے چراغ مر گیا ہے

ہمیں تو وقت نے کچھ بھی نہیں بنانے دیا
تمھی دکھاؤ ، اگر کچھ نیا بنا لیا ہے

خود میں اتنی نہیں تھی گنجائش
ہم کسی دوسرے میں بس گئے ہیں

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی!

مرزا لیٹین کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ حاجی حبیب الرحمٰن کو ایس ایس پی رحیم یار خان مقرر کر دیا گیا۔ مرزا لیٹین نہایت دھیمے مزاج کا افسر تھا۔ پڑھا لکھا، مہذب، شریف النفس اور پروفیشنل اس کے برعکس حاجی صاحب کا اپنا طریق کار تھا۔ کہتے ہیں کسی افسر کی شہرت اس کی آمد سے قبل ہی علاقے میں پہنچ جاتی ہے۔ حبیب الرحمٰن ذہنی طور پر سول سروس کی برتری تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس لئے ہر جگہ کسی نہ کسی رنگ میں سینگ اڑا لیتا تھا۔ ڈی سی کو نیچا دکھانے کا

اس نے بڑا نادر طریقہ ڈھونڈا تھا جس کی پہلی آزمائش ساہیوال میں کی۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ڈی سی کو سلیوٹ نہ کیا جائے۔ بظاہر تو یہ بڑی معمولی سی بات لگتی ہے لیکن اس سے ڈپٹی کمشنر کی بالآخر تمام اتھارٹی Erode ہو جاتی ہے۔ جب ضلع میں مشہور ہو جائے کہ یہ کیسا ڈی سی ہے جس کو پولیس کے سپاہی تک سلام نہیں کرتے تو وہ باقی لوگوں سے کیا توقع رکھے گا۔ ڈی سی کی گارڈ میں ایسے آدمی بھیجتا جو دراصل اس کے لئے جاسوسی کرتے اور شام کو ایس پی صاحب کو خبر ہو جاتی کہ ڈی سی نے کیا کھایا ہے، پیا ہے، کون سے لوگ اسے ملنے آتے ہیں، سودا سلف مفت آتا ہے یا جیب کو ہوا کھلاتا ہے۔ وغیرہ

تجمل عباس شاہ درویش منش انسان تھا۔ صلح کل طبیعت تھی اور بڑے غیر جذباتی انداز میں کاروبار حکومت چلاتا تھا۔ ان تمام ناجوازیوں کے باوجود کام کسی نہ کسی طور پر چلتا رہا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ایس پی کے لئے کئی مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا ایک ڈی او سیکرٹریٹ کی غلام گردشوں میں ہلچل مچا سکتا تھا۔ اس امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے حاجی صاحب نے اس کا حل بھی ڈھونڈ رکھا تھا۔ ہر جمعہ کی نماز یہ باقاعدگی سے لاہور جا کر اتفاق مسجد میں پڑھتے۔ نماز ختم ہوتے ہی وہ میاں شریف کے جوتے اُٹھا کر ان کے پاؤں کے نزدیک کر دیتے۔ ایک دن میاں شریف نے اپنے وزیر اعلیٰ بیٹے کو کہا "یہ ایس پی بہت چالاک آدمی ہے یا پھر نیکی کا مجسمہ ہے۔" نیکی کے اس مجسمے کو اپنی جگہ سے ہلانا ایک درویش ڈی سی کے بس کا روگ نہ تھا۔

جب حاجی حبیب الرحمٰن کا تبادلہ ہوا تو مجھے تجمل عباس شاہ کا خط آیا۔ غالباً زندگی میں انہوں نے پہلا اور آخری خط لکھا تھا اور وہ بھی ایک سطر تک محدود تھا۔ انہوں نے لکھا "حاجی حبیب الرحمٰن صاحب کا تبادلہ رحیم یار خان ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے" نیچے اپنے نام سے پہلے دعا گو کی اضافت کی تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ بعض لوگ خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں۔ بین السطور معانی اور مفاہیم جاننے کا فن مجھے بھی آتا تھا۔

حاجی صاحب دفتر آئے تو بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے "میں نے آپ کے متعلق کافی سن رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے دوستوں دشمنوں نے میرے متعلق بھی آپ کو کچھ نہ

کچھ بتایا ہو۔ بس آپ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھیں۔ آپ کی لیڈر شپ میں ہم نے اس ضلع کو مثالی ضلع بنانا ہے، رشوت کا خاتمہ کرنا ہے، سماج دشمن عناصر کا قلع قمع کرنا ہے۔ اس کے لئے مجھے لاہور سے دو افسر چاہئیں۔ انسپکٹر ڈار اور ڈی ایس پی ملک تصدق حیات۔ آپ آج ہی فون کر کے انہیں بلوالیں۔ آپ کی ایوان وزیر اعلیٰ میں بڑی شنوائی ہے۔ سنا ہے آپ کے ڈی او نے مرزا لیسین کو جوہر ٹاؤن میں ایک کنال کا پلاٹ دلوایا ہے۔ میں درویش ہوں مجھے پیسے ٹکے کی حاجت ہے اور نہ خواہش۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں پولیس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ یہ ایس پی کا کام ہے۔ البتہ ضلع کی پالیسی میں مرتب کرتا ہوں اور اس پر عملدرآمد کی بھی توقع رکھتا ہوں۔ میں نے فون کر کے ڈار اور ملک تصدق کو بلوالیا۔

حاجی حبیب الرحمٰن نے آتے ہی تہلکہ مچا دیا۔ سارے مقامی پریس کی دعوت شیراز کر ڈالی۔ سارے ضلع کے تھانیداروں کو بلا کر کیمروں کے سامنے حلف لیا کہ وہ رشوت لینا بالکل بند کر دیں گے۔ علمائے کرام کو بلا کر ان کے گھٹنوں کو چھوا۔ ڈاڑھیوں اور ہاتھوں کو احترام سے چوما۔ ان کے قدموں کی خاک کو سرمہ نور بصر قرار دیا اور اپنی تقریر میں کچھ ایسا تاثر دیا جیسے ساری کائنات جبہ و دستار نے تھامی ہوئی ہے۔ ابھرتی ہوئی عسکری تنظیموں کی پشت کو بھی ہلکے سے تھپتھپایا۔ اپنے گھر میں رات کو ضلع کے بااثر لوگوں کی میٹنگ بلا کر انہیں اپنے ارشادات عالیہ سے نوازا۔ شہر کے متمول تاجروں کو ساتھ لے جا کر ہر مسجد کا دورہ کیا اور اس کی ''تزئین و آرائش'' کے لئے ان سے چندہ دلوایا۔

کچھ دیر کے لئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ضلع میں نیا ایس پی نہیں آیا بلکہ انقلاب آ گیا ہے۔ انصاف کے بند دروازے سم سم کھل گئے ہیں۔ ظلم اور ناانصافی کو دریائے سندھ میں ڈبو دیا گیا ہے۔ رشوت ستانی چار سو ہاتھ جوڑتی نظر آ رہی ہے۔ جرائم کا جوڑ جوڑ ہل گیا ہے۔ راہی مسافر سڑکوں پر سونا اُچھالتے ہوئے بے فکر پھر رہے ہیں لیکن یہ تاثر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ ڈار نے ڈاکوؤں سے لوٹی ہوئی رقم تو اُگلوالی لیکن وہ لٹنے والے تک کسی وجہ سے نہ پہنچ پائی۔ انسپکٹر صادق نے سندھ کے ڈاکو تو پکڑے لیکن خود صادق ڈکیت مشہور ہو گیا۔ جب آرائیوں نے پر

پرزے نکالنے شروع کیے تو جاٹوں اور گجروں کے کان اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی کنوتیاں عموداً اُٹھتی ہیں۔

نامعلوم وجوہ کی بنا پر حاجی صاحب اہم قدم اُٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرتے۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ میں نے جو مشورہ بھی دیا انھوں نے اُلٹا عمل کرنا ہے۔ اس لئے میں انہیں ہمیشہ صحیح مشورہ دیتا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے مخدوم الطاف سے اس کے آموں کے باغ میں خفیہ میٹنگ کی ہے اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے خلاف میں میاں نواز شریف کے کان بھرتا ہوں۔ یہاں تک بھی قابل برداشت تھا کیونکہ ایک تو مخدوم الطاف میرا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا اور دوسرا مرکز کا ملازم ہونے کے ناطے انہیں ڈر تھا کہ الطاف کے ایما پر انہیں مرکز سے بلاوا نہ آ جائے۔ جب مجھے معتبر اطلاع ملی کہ ایک مذہبی تنظیم سے اس لئے پینگیں بڑھا رہے ہیں کہ اگر ڈی سی کو بلیک میل کرنا پڑے تو سہولت رہے گی تو میں نے محسوس کیا کہ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

ایک دن حکم آیا کہ انہیں او ایس ڈی لگا دیا گیا ہے اور وہ فوراً چارج چھوڑ دیں۔ حاجی صاحب کی ناراضی تو 'جائز' تھی لیکن پوری برادری میں بھونچال آ گیا۔ وہ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے لیکن جاتے جاتے اپنے پیروکاروں کو چند واضح اشارے بھی کر گئے۔ اگلے دن ان کے حق میں تبادلہ رکوانے کے لئے ایک بہت بڑا جلوس نکلا جس کی قیادت میاں عبدالخالق نے مولوی رؤف ربانی سے کروائی۔ دستور کے مطابق نعرہ زن جلوس میرے دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔ میں منتظر تھا۔ میں نے باہر نکل کر حاجی صاحب کے حق میں ایک دھواں دھار تقریر کی اور حکومت سے ناراضی کا اظہار کیا کہ اتنے نیک افسر کو تین ماہ کے قلیل عرصے میں کیوں بدل دیا گیا ہے۔ میں نے ان کے خیالات حکومت تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ آخر میں جب میں نے یہ کہا کہ شاید ہم گنہگار لوگ ہیں جو نیک افسر ہم سے جلد چھن جاتے ہیں تو ہجوم آبدیدہ ہو گیا اور ڈی سی زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا منتشر ہو گیا۔ میں نے رؤف ربانی کو چائے کے لئے روک لیا۔ دفتر میں آیا تو میں نے کہا ''تم شرارتوں سے باز نہیں آؤ گے۔''

کہنے لگا ''آپ نے ایک بار پھر میاں عبدالخالق کا کھیل بگاڑ دیا ہے جہاں تک میرا تعلق ہے میں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ گھوڑے کو تو گھاس چاہئے کہیں تو کل

اس کے خلاف جلوس نکلوا دوں۔ بس گھاس کا بندوبست ہونا چاہئے۔ دلچسپ باتیں کرتا تھا۔

حبیب الرحمٰن کے بعد راجہ امتیاز تعینات ہوا۔ راجہ رینکر تھا اور ریٹائرمنٹ کے قریب۔ جب رینکر ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچتا ہے تو خاصا محتاط ہو جاتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ ملک وارث پنجاب کے مشہور رینکر ایس پی تھے۔ ہمارے دوست تھے۔ ایک دفعہ کسی تقریب میں راؤ رشید کی کتاب ''جو میں نے دیکھا'' کا ذکر چھڑا تو ملک صاحب بولے ''شاہ صاحب! میرا بھی بڑا دل کرتا ہے کہ میں ایک کتاب لکھوں ''جو میں نے کیا'' پھر پنشن کا خیال آ جاتا ہے کہ سرکار دولت مدار کا کیا بھروسہ ہے۔ کسی وقت بھی ناراض ہو کر ضبط کر سکتی ہے۔ راجہ امتیاز ریٹائرمنٹ تک وہاں رہا اور کسی قسم کا کوئی مسئلہ کھڑا نہ کیا۔

اس اثنا میں ملک عبدالمجید کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ ۶۰ بیچ کے یوسف خان صاحب تعینات ہوئے۔ خان صاحب نذیر سعید کے سسر تھے جو میاں نواز شریف کا افسر بکار خاص تھا۔ خان صاحب، صاحب علم تھے انھوں نے حیاتِ قائد پر ایک کتاب بھی لکھی۔ نہایت عمدہ اردو اور انگریزی بولتے۔ اُردو تو خیر ان کی مادری زبان تھی لیکن انگریزی کے اڑیل گھوڑے کی راسیں بھی بڑی مضبوطی اور اعتماد کے ساتھ تھام رکھی تھیں۔ کتاب بھی اسی زبان میں لکھی تھی۔ ایماندار افسر تھے۔ گزر اوقات بھی کتاب کی Push sale پر ہوتی۔ ان تمام خوبیوں کے باوصف طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ نسیان کا مرض تو نہیں تھا لیکن خاصے بھلکڑ تھے۔ ایک مرتبہ بڑی ناخوشگوار صورت پیدا ہو گئی۔ میاں نواز شریف کا دورہ تھا انھوں نے بہاول پور سے کوئی ضروری فائل لانی تھی۔ وہ بھول آئے۔ میاں صاحب نے جب ایئرپورٹ پر کاغذات مانگے تو خان صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ غالباً ان کاغذات کا تعلق زمین سے تھا اور وہ محل میں بھجوانے تھے۔ میاں صاحب نے ناراضی کا اظہار کیا تو خان صاحب کے اوسان خطا ہو گئے۔ استقبال کے لئے آئے ہوئے لوگوں سے مل کر میاں صاحب نے جب ان کا پوچھا تو وہ غائب تھے۔ وائرلیس پر چیک کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ہم سب پریشان ہو گئے۔ ہم نے ہر طرف ہرکارے دوڑائے لیکن سمجھ نہیں آتی تھی کہ آناً فاناً انہیں زمین نگل گئی ہے یا آسمان کھا گیا ہے۔ میاں صاحب کا موڈ آف ہو گیا۔ کافی دیر کے بعد پتہ چلا کہ وہ فائل لینے خود

بہاول پور چلے گئے ہیں۔ اکثر افسر اُن کی پیٹھ کے پیچھے ان کا مذاق اُڑاتے۔ ان کے احکامات کو بھی کچھ خاص سنجیدگی سے نہ لیتے لیکن میں نے ان کا ہمیشہ احترام کیا۔ کبھی ان سے Liberty لینے کی کوشش نہ کی بلکہ علمی میدان میں کچھ نہ کچھ سیکھا۔ انگریزی ادب پر بھی بڑی اتھارٹی کے ساتھ بولتے۔ صاف گو انسان تھے۔ ایک مرتبہ شیخ زید کے منصوبوں کے منیجر افضل صاحب انہیں ملنے گئے اور اپنا تعارف کرایا تو خان صاحب فٹ سے بولے "اچھا تو آپ بھی ہز ہائی نس کے درباریوں میں سے ہیں۔" افضل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چوہدری منیر اور میں بھی وہاں موجود تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔

اصغر کریجہ ممبران اسمبلی میں سب سے زیادہ بذلہ سنج تھا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ میاں صاحب کتنے ہی سنجیدہ موڈ میں کیوں نہ ہوتے یہ انہیں ہنسا دیتا۔ اس کا تعلق لیاقت پور کے قصبے شیدانی شریف سے تھا۔ اصغر سیاسی طور پر زیادہ مضبوط نہ تھا۔ شومئی قسمت سے اس کا عزیز کالے میاں بیمار پڑ گیا۔ کالے میاں جمال کریجہ کا بڑا بھائی تھا۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں وہ بڑا بااثر تھا۔ کہنے کو تو وہ عارضہ قلب میں مبتلا تھا لیکن درحقیقت وہ بیماری دل نہیں بلکہ نفسیاتی عارضہ تھا جس نے اسے ہلکان کر رکھا تھا۔ اسے وہم ہو گیا تھا کہ اس کا دل کسی وقت بھی بیٹھ سکتا ہے۔ چنانچہ کار کے بجائے وین میں سفر کرتا اور ہر وقت دو ڈاکٹر اس کے ساتھ ہوتے۔ اس کی بیماری کی وجہ سے جمال کریجہ کا اثر و رسوخ بھی کم ہو گیا۔ اس نے مذہب کی طرف رجوع کر لیا۔ احمد عالم علاقے کی اُبھرتی ہوئی سیاسی طاقت تھی۔ کریجوں کا پیر خانہ تو تھا لیکن وہ سید نہ تھے۔ علاقے کے لوگ کافی حد تک پیر پرست ہونے کے علاوہ سید پرست تھے۔ اس اعتبار سے احمد عالم انور ٹوان دن تھا اصغر کریجہ بھی اس کی مدد سے ممبر اسمبلی بنتا۔

میاں صاحب کا رحیم یار خان کا دورہ تھا۔ ابوظہبی کے شاہی خاندان سے تعلقات اس قدر استوار ہو چکے تھے کہ وہ انہیں وقتاً فوقتاً دعوت پر بلاتے رہتے۔ ایک سال شیخ زید علالت کی وجہ سے نہ آ سکے تو کراؤن پرنس شیخ خلیفہ آیا۔ اس کے استقبال کے لئے میاں صاحب خود آئے۔ حسب دستور ان کا شاندار استقبال ہوا۔ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اصغر کریجہ نے انہیں رات کے کھانے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ اس پر چوہدری مسعود نے بھی شام کی چائے کی

دعوت دے ڈالی۔ وہ کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ حکمرانوں کو سیاست میں توازن رکھنا پڑتا ہے۔ ایک ہی پارٹی میں لیفٹ رائیٹ اور سنٹر ہوتا ہے۔ چنانچہ میاں صاحب نے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق اس کی دعوت بھی قبول کر لی۔ گویا بڑا مصروف دن تھا۔ لنچ شیخ خلیفہ کے ساتھ۔ شام کی چائے لیاقت پور کے ریسٹ ہاؤس میں اور رات کا کھانا شیدانی شریف۔ رات کو لیاقت پور ریلوے سٹیشن پر ان کا سیلون لگنا تھا۔

ہم محل میں پہنچے ہی تھے کہ خورشید نے بتایا کہ اے سی لیاقت پور عارف کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فون سنا تو وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا اور ہکلا کر بول رہا تھا۔ کہنے لگا "یہاں پیپلز پارٹی کا ایک گروپ بے نظیر کے حق میں نعرہ بازی کر رہا ہے۔ انہوں نے چوک پر اپنے جھنڈے بھی لگا دیئے ہیں۔ میاں صاحب کی آمد پر وہ کوئی شرارت کر سکتے ہیں۔ اس لئے آپ انہیں مشورہ دیں کہ وہ روٹ بدل دیں۔"

میں نے کہا "تم کس مرض کی دوا ہو ان کو منتشر کر دو۔"

بولا "یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔" لنچ کے بعد جب ہم چلے تو سارے راستے میں لوگ استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ گاڑیاں اس قدر کثیر تعداد میں تھیں کہ عملاً انہیں کراس کر کے آگے نکلنا ناممکن ہو گیا۔ اے سی بار بار وائرلیس پر مشورہ دے رہا تھا کہ میاں صاحب لیاقت پور نہ آئیں۔ میں نے اسے واضح ہدایت کی "مجمع کو منتشر کر دے۔" اب گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس بات کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہاں مخالفین کی تعداد کتنی ہے، وہ کیا چاہتے ہیں اور اے سی اس قدر پریشان کیوں ہے۔ جب ہم نے خان پور کراس کیا تو اے سی نے وائرلیس کے ذریعے پیغامات کی بوچھاڑ کر دی اور کچھ اس قسم کا تاثر دیا جیسے کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو سکتا ہے۔ ڈی آئی جی ملک حمید اسلم، ایس پی اور میں ایک گاڑی میں سوار تھے۔ اچانک ملک حمید اسلم نے موٹر کیڈ رکوا دیا۔ وزیر اعلیٰ کی گاڑی رکتی ہی تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کہنے لگا "شاہ صاحب! گھبراہٹ میں غلطی ہو گئی ہے۔ اب آپ صورت حال کو سنبھالیں۔" ہم گاڑی سے نیچے اُتر آئے۔

"قافلہ کس نے روکا ہے؟" میاں صاحب نے پوچھا۔ حمید اسلم اور ایس پی نے منہ دوسری طرف پھیر لئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اے سی نے اطلاع دی ہے کہ پیپلز پارٹی

کے ورکر چوک پر نعرہ بازی کر رہے ہیں۔
"تو کیا ہوا؟" ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ قافلہ چل پڑا۔ جب ہم لیاقت پور پہنچے تو پتہ چلا کہ مٹھی بھر لوگ تھے جو ہجوم میں خس وخاشاک کی طرح تتر بتر ہو گئے۔
ریسٹ ہاؤس میں چائے کا بندوبست تھا۔ وزیراعلیٰ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میاں خالق میرے پاس آیا۔ بولا "علیحدگی میں کوئی بات کرنی ہے۔ میں اسے دوسرے کمرے میں لے آیا۔"
کہنے لگا "مسعود دعوت تو دے بیٹھا ہے لیکن خرچے کی وجہ سے بدک رہا ہے۔"
کہتا ہے "اصغر کریجے کی دعوت کے اخراجات ڈی سی صاحب کے ایما پر محکمہ مال اُٹھا رہا ہے۔ آپ تحصیلدار کو کہہ کر اس دعوت کے اخراجات کی ادائیگی بھی کروادیں۔"
میں نے غصے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا تم مذاق کر رہے ہو۔"
"نہیں تو......"
"اسے ہمت کیسے ہوئی ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس کا پیٹ چیر کر لوٹی ہوئی سب دولت نکال لوں۔ کیا تمہیں علم ہے کہ چولستان کی سرکاری زمینوں پر اس نے قبضہ کر لیا ہے۔ تعمیراتی منصوبوں میں کمیشن لیتا ہے۔ تحصیل کے اہلکاروں سے منتھلی وصول کرتا ہے۔" خالق مزید کچھ نہ سن پایا اور پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔ خالق کے جاتے ہی میں نے اے سی کو اندر بلا لیا۔
"تمہیں اے سی کس نے بنایا ہے؟" میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔
"اس قدر ڈرپوک اور کم ہمت شخص کو تو کسی بنیا کا منشی ہونا چاہئے۔ تم نے آج جو Embarrasment creat کی ہے وہ ہمارے ضلع کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔"
لجاجت سے بولا "سر غلطی ہو گئی ہے۔ میں نے مخالفین کی تعداد کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ دراصل مجھے ڈی ایس پی نے ڈرا دیا تھا۔ معاف کر دیں۔" اس کا والد سردار خان ننکانے کا متمول اور شریف آدمی تھا۔ کمیٹی کا چیئرمین بھی رہا۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا تھا اسے مزید کیا کہتا۔
اصغر کریجے نے بڑی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ بہاول پور سے پولیس بینڈ بھی منگوا لیا تھا۔ سارے قصبے کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ ضلعے کے سب ممبران اسمبلی بھی شریک تھے۔ بذلہ سنج تو تھا ہی، میاں صاحب کو ہنسا ہنسا کر ان کا موڈ ٹھیک کر دیا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب ہم ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو میاں صاحب مجھے ایک

طرف لے گئے۔

کہنے لگے ''باہر ایک شخص ریڑھی پر گنڈیریاں بیچ رہا ہے۔ چپکے سے چار سیر گنڈیریاں منگوالیں۔'' میں نے اسی سرگوشی کو مجسٹریٹ کے کان میں پلٹ دیا۔ کافی دیر تک وہ لوگ نہ آئے تو مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ میاں صاحب تین بار پوچھ چکے تھے کہ ''مال مطلوبہ'' کیوں نہیں پہنچا۔ چالیس منٹ کے طویل انتظار کے بعد مجسٹریٹ ٹوکری اٹھائے آن پہنچا۔ ٹوکری گنڈیریوں سے نہ صرف لبالب بھری ہوئی تھی بلکہ اس پر کیوڑہ اور گلاب کی پتیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ تاخیر اس لئے ہوئی کہ گنڈیری فروش نے جب سرکاری گاڑیاں دیکھیں تو وہ ڈر کر ریڑھی بھگا کر لے گیا تھا۔ پولیس نے اس کے گھر جا کر تازہ گنڈیریاں کٹوائی تھیں۔

گاڑی آنے میں کچھ دیر تھی۔ میاں صاحب اپنے سیلون میں چلے گئے اور ہم پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے ملازم نے پیغام دیا کہ انہوں نے ڈی سی کو یاد فرمایا ہے۔ میں اندر گیا تو وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور اس کے ساتھ ساتھ گنڈیریوں سے بھی پورا انصاف کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں ''قصہ ایک گنڈیری فروش کا'' سنایا تو بڑے محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے میری طرف سے اسے دو ہزار روپے بھجوا دیں۔ بے چارہ خواہ مخواہ پریشان ہوا ہوگا۔ وہ نصف گھنٹے تک علاقے کے ممبران اسمبلی کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے مجھے احساس ہوا کہ کمشنر اور ڈی آئی جی باہر پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں اور تمام اہلکار دیکھ رہے ہیں کہ ڈی سی تو اندر چلا گیا ہے اور وہ باہر ٹانگوں کی آزمائش کر رہے ہیں۔ اسی قسم کی نفسیاتی کیفیتیں اور دبا دبا غم و غصہ اختلافات کو جنم دیتا ہے۔ میں نے وزیراعلیٰ کو درخواست کی کہ انہیں بھی اندر بلا لیا جائے۔ جب وہ سیلون میں آئے تو چھوٹتے ہی میاں صاحب نے کمشنر سے کہا ''ڈی سی بہاولپور منیر خان کی کرپشن کی مسلسل شکایات آ رہی ہیں۔ عاشق کو پاتنگ کے کہنے پر میں نے لگا تو دیا ہے لیکن اس کے طور اطوار ٹھیک نہیں ہیں۔ اس کو کہو سیدھا ہو جائے نہیں تو مجھے ایکشن لینا پڑے گا۔'' رات ساڑھے بارہ کے قریب گاڑی پہنچی تو ہم نے انہیں الوداع کہا۔

[جاری ہے۔]

غزل

وہ گلی ہم سے چھوٹتی ہی نہیں
کیا کریں ، آس ٹوٹتی ہی نہیں

سحر آثار شام کی سرخی
لبِ جاناں سے چھوٹتی ہی نہیں

نیند سی نیند ہے ، تھکن سی تھکن
ایک پَو ہے کہ پُھوٹتی ہی نہیں

اِک دھندلکے میں عمر بیت چلی
تیرگی ہم سے روٹھتی ہی نہیں

جان دے دیں ، مگر کِسے ، خالد
زندگی ہم کو لوٹتی ہی نہیں

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا سخن فہم نظر تھی جس نے
بات کوئی بھی نہ مانی میری

غزل

روگ جو اَب کے لگا ہے کبھی جانے کا نہیں
اب جو دہکا ہے الاؤ وہ بجھانے کا نہیں

ایسا اک شخص مجھے جان سے پیارا ہوا ہے
وہ جو پانے کا نہیں، وہ جو بھلانے کا نہیں

اُس نے یوں میرے دل و جاں میں سرایت کی ہے
اب کسی طور بھی میں اُس کو بھلانے کا نہیں

آخری عمر کا ہے عشق، خدا خیر کرے
جان لے جائے گا ورنہ تو یہ جانے کا نہیں

نہیں آتا تو نہ آئے مری چاہت کا یقیں
چیر کر دل بھی تو میں اس کو دکھانے کا نہیں

اُس نے کچھ ایسے اجاڑا ہے مرے دل کا مکاں
جو کسی اور کے بھی بسنے بسانے کا نہیں

مجھ کو اپنے دلِ خوش فہم نے برباد کیا
میں کسی اور پہ الزام لگانے کا نہیں

عزتِ نفس بھی اپنی مجھے پیاری ہے بہت
تیرے کوچے کی تو میں خاک اُڑانے کا نہیں

دکھ سنا دینے سے ہو جاتا ہے کچھ دکھ ہلکا
دکھ مگر یہ ہے کہ دکھ اپنا سنانے کا نہیں

میرا دکھ جاننے کو کیا مری آنکھیں کم ہیں
میں ترے سامنے آنسو تو بہانے کا نہیں

خُلق و اخلاص و وفا، مہر و مروت کا چلن
نہیں جس شخص میں وہ میرے گھرانے کا نہیں

کٹ کے رہ جائے نہ دنیا سے کہیں یار سکون
اک چلن بھی ترا موجودہ زمانے کا نہیں

سلطان سکون

غزل

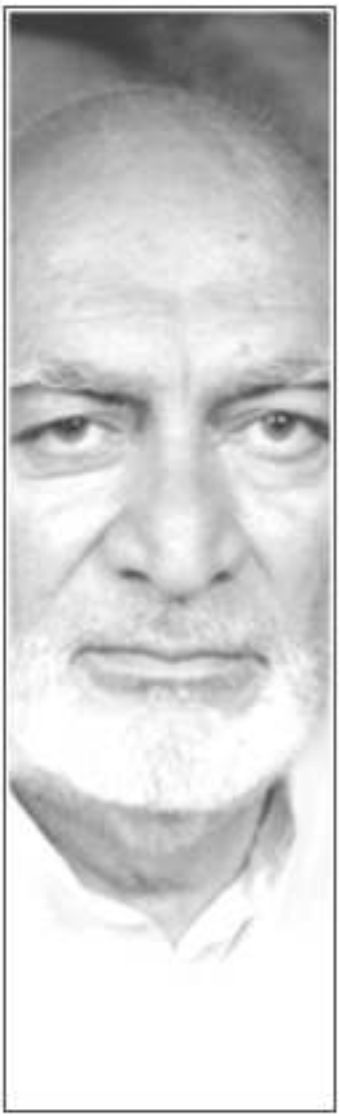

ایسے بھرے جہاں میں اکیلا ہوا کوئی
اس کے بغیر جینا بھی جینا ہوا کوئی

اندر کا حال کھول کے دیکھا کرے گا کون
جب آہنی دراز کا بستہ ہوا کوئی

کیسے چھڑا کے ہاتھ وہ آگے چلا گیا
پھرتا ہے اب تلاش میں بچھڑا ہوا کوئی

کوئی چراغ بجھنے لگے قہقہے کے ساتھ
جلتا ہے آہِ سرد سے بجھتا ہوا کوئی

مجھ کو وضاحتوں کے لیے لفظ چاہیے
انجان بن گیا ہے جو سمجھا ہوا کوئی

بھولے ہوئے خیال کی شدت کو یاد کر
تو بھیج مجھ کو شعر بھلایا ہوا کوئی

ثاقبؔ ہوا کے ساتھ ہیں آہیں مچل گئیں
کرتا ہے مجھ کو یاد جو بھولا ہوا کوئی

آصف ثاقب

غزل

مرا کارِ جنوں کس کا ہدف ہے
یہ منصب چھوڑ دوں، کس کا ہدف ہے

عداوت شُبھ شبیہوں سے ہے کس کو
ہر اک روشن شگوں کس کا ہدف ہے

اڑا دے دُھول پانچوں پانیوں میں
برون و اندروں کس کا ہدف ہے

کسی لمحے کہیں کچھ بھی نہ بدلے
رہے سب جوں کا توں، کس کا ہدف ہے

رہے پندار میرا اس کے در پر
ہمیشہ سر نگوں، کس کا ہدف ہے

بچا رکھا ہے جو اک خواب اب تک
بتا کس سے کہوں کس کا ہدف ہے

نہ میں ڈوبوں نہ دریا پار اتروں
بھنور ہی میں رہوں، کس کا ہدف ہے

زمانے بھر میں میرا چاند تارا
میں کس کس کو گنوں، کس کا ہدف ہے

بجائے جوئے حسن و خیر عالی
بہائے نہرِ خوں کس کا ہدف ہے

جلیل عالی

غزل

سخن میں آگ رکھے جا رہے ہیں
مسلسل جھوٹ بولے جا رہے ہیں

ہمیں افسوس ہے تیرے لیے کچھ
ادھورے کام چھوڑے جا رہے ہیں

محبت ہے کہ ہوتی ہی نہیں ہے
نظریے ہیں کہ بدلے جا رہے ہیں

کہاں لے جائیں ہم ہونے کو اپنے
زمیں پر بوجھ بنتے جا رہے ہیں

کبوتر ہے کہ اڑتا ہی نہیں ہے
ہمارے کام بگڑے جا رہے ہیں

بتانا چاہتے ہیں سچ بھی اس کو
اداکاری بھی کرتے جا رہے ہیں

نہیں لکھتے ہم اپنے طور کچھ بھی
مگر؛ جو لفظ لکھے جا رہے ہیں!

دعا کو کر رہے ہیں ہم بھی زخمی
نہ جانے کیا کیا مانگے جا رہے ہیں

کمی پوری دیوں کی کر رہے تھے
مگر اب ہم بھی بجھتے جا رہے ہیں

خدا جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے
بلا مقصد ہی دوڑے جا رہے ہیں

محسن اسرار

غزل

جاں کا ہوئے ہیں روگ، بڑی معذرت کے ساتھ
اپنے ہی چند لوگ، بڑی معذرت کے ساتھ

جب لوگ جشنِ مرگ منانے میں مست تھے
مَیں نے منایا سوگ بڑی معذرت کے ساتھ

اِس شہرِ کِذب کے ہیں تقاضے بڑے عجیب
سچ بولتے ہیں لوگ بڑی معذرت کے ساتھ

بس اے جنونِ عشق، مرا راستہ الگ !
تُو ہو گیا ہے روگ، بڑی معذرت کے ساتھ

آہستگی سے ہوتے ہیں اِک دِن کنارہ کش
بے حد قریبی لوگ بڑی معذرت کے ساتھ

دُنیا، تِری کشش میں خسارے بہت ہوئے
مَیں لے رہا ہوں جوگ بڑی معذرت کے ساتھ

سچ بولنے پہ جن سے حمایت کی تھی اُمید
چپ ہو گئے وہ لوگ بڑی معذرت کے ساتھ

نسیمِ سحر

غزل

فرماں روا کے گھر میں زر و مال ہو تو ہو
اُس کی بلا سے اب کوئی بے حال ہو تو ہو

رہبر خدا ہی بھیجے گا اتنا یقین ہے
کوئی یہاں ولی ہو یا ابدال ہو تو ہو

برپا ہو انقلاب حقیقی تو بات ہے
میرے وطن میں ایسا کوئی سال ہو تو ہو

وہ غازۂ ہنر ہو کہ سیرت کا حُسن بھی
رخسارِ وقت پر کوئی اب خال ہو تو ہو

دولت کے ڈھیر خاک ہیں اپنی نگاہ میں
اپنی طرف سے اب کوئی خوش حال ہو تو ہو

بڑھتی رہے گی اور گرانی یہ دیکھنا
آبادیوں کا اب یہاں جنجال ہو تو ہو

اس کارواں کو مل گیا اذنِ سفر اگر
دشمن کا دل بھی راہ میں پامال ہو تو ہو

قحط الرجال دیکھ کے آتا رہا خیال
صدیوں کے بعد اب یہاں اقبال ہو تو ہو

حسن عسکری کاظمی

غزل

بزم میں باریاب تھا کل شب
ذرّہ بھی آفتاب تھا کل شب

اُس نے میرا بھی حال پوچھا تھا
میں بھی عزّت مآب تھا کل شب

کون نادم محبّتوں پہ ہوا
پھر بھی اِک اِضطراب تھا کل شب

کس سمندر کی بات کرتے ہو
چشم کا ہمرکاب تھا کل شب

آنکھ کی قید میں رکھے آنسو
گرچہ دُکھ بے حساب تھا کل شب

ناصر علی سیّد

میرے پہلو میں چاند سویا تھا
کیا مزے کا وہ خواب تھا کل شب

کھل گئی نیند اوّلِ شب میں
پھر تو پَل پَل عذاب تھا کل شب

بخش بیٹھا تھا جاں کے دشمن کو
دل مِرا بو تراب تھا کل شب

غزل

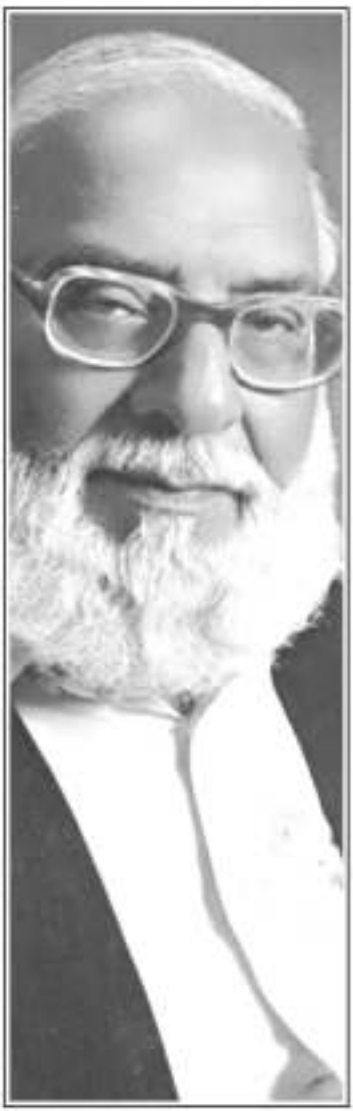

راس آئے خدوخالِ دل نشیں
ہیں محبت آفریں، بے حد حسیں

بے غرض خواہش، شرف انسان کا
ہے موقر جذبہ صدق و یقیں

معتبر ہے حسنِ معنی سے ہنر
جو حصارِ جاں میں ہے دل کے قریں

رنگ پر جو ہیں چمن کی رونقیں
خونِ دل سے ہیں حرارت آفریں

کب مری شادابیاں لوٹاؤ گے
پوچھتی ہے ہم سے یہ بنجر زمیں

خواہشیں جس کی ہوئی ہیں بے لگام
معتبر وہ شخص ہو سکتا نہیں

کج ادائی کا یہی عالم رہا
مر نہ جائیں نیم بسمل پھر کہیں

ہو ریاضِ جاں میں گر وہ جلوہ گر
سرخوش و شاداب ہو دل کی زمیں

سید ریاض حسین زیدی

غزل

دھند کو ہم نے آسماں جانا
واہمہ تھا جسے گماں جانا

اک اشارے کو ہم نے ہاں جانا
اک کہانی کو داستاں جانا

قرب کی ہر گھڑی کو ہر لمحہ
دھڑکنوں کا ہی ترجماں جانا

بیٹھ کر خود وفا کی کشتی میں
پیار کو اپنے بادباں جانا

اپنے ہاتھوں ہی ہار بیٹھے ہیں
زندگی کا جسے نشاں جانا

جب نظر سے ہدف ہی اوجھل تھا
کیوں کماں کو ہے درمیاں جانا

یہ بھی اس دل کی بے نیازی ہے
دشمنِ جاں کو راز داں جانا

رکھ رکھاؤ کی بات تھی جس کو
سب نے شاعر ہی کی زباں جانا

حیف ہے وہ بھی راہزن نکلا
جس کو ہے میرِ کارواں جانا

آفریں ہم نے ہر ہزیمت کو
زندگانی کا امتحاں جانا

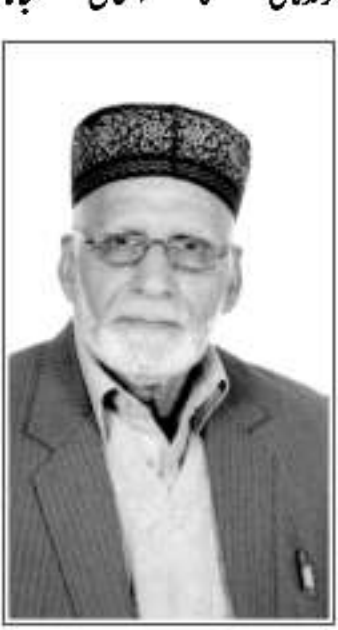

رشید آفرین

غزل

دروازہ مرا ایک زمانے سے کھلا ہے
لیکن مرا گھر آپ کے آنے سے کھلا ہے

اک تو ہی نہیں میں بھی محبت کے ہوں لائق
مجھ پر یہ ترا ساتھ نبھانے سے کھلا ہے

کچھ حسن کا زعم اور جوانی کا تکبر
مجھ سے وہ بہت حیلے بہانے سے کھلا ہے

اس طرح گیا وقت پھر آتا ہے پلٹ کر
یہ مجھ پہ ترے لوٹ کے آنے سے کھلا ہے

تعبیر مرے پاؤں کی زنجیر بنی ہے
وہ خواب کہ جو مجھ پہ سرہانے سے کھلا ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزل

وجود ہو چاہے ختم دارا کا خنجروں کے مقابلے میں
مزاحمت پھر بھی ہے ضروری سکندروں کے مقابلے میں

عجیب معمول ہم نے دیکھا شکست صدیوں سے کھا رہے ہیں
اگرچہ ہیں ناتواں زیادہ تناوروں کے مقابلے میں

کبھی تو ایسا بھی ہو مُو لے نکال دیں باز کی بھی آنکھیں
عقاب ہر بار کیوں ہوں غالب کبوتروں کے مقابلے میں

اسی کا پانی ہے صاف میٹھا یہی مداوا ہے تشنگی کا
ترے لیے آب جُو ہے بہتر سمندروں کے مقابلے میں

یہی مروج اصول دیکھا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے
نہ کام آئے گی موم کی ڈھال پتھروں کے مقابلے میں

کہیں اکھاڑے میں جا کے پہلے دفاع کے داؤ پیچ سیکھیں
اگر اُترنا ہے دوستوں کو دلاوروں کے مقابلے میں

کہیں ابوجہل و بولہب ہیں کہیں یہودا کہیں زُلیخا
کمال کی مشکلات آئیں پیمبروں کے مقابلے میں

جہاں تھی گلزار بُت پرستی وہیں پہ نکلے ہیں بُت شکن بھی
کسی براہیم کو بھی دیکھا ہے آزروں کے مقابلے میں

گلزار بخاری

غزل

درد کی لہر سی اٹھتی ہے سدا اندر سے
ڈھانپ لیتی ہے مجھے غم کی قبا اندر سے

جس کی پیشانی پہ محراب نہ دکھلائی دے
کیا وہ کرتا نہیں تکبیر و ثنا اندر سے

ہاتھ اور دل جو بہم ہوں تو اثر لازم ہے
ہاتھ اٹھتے ہی نکلتی ہے دعا اندر سے

آنکھ کھڑکی سے تو ہٹتی ہی نہیں ہے میری
جب سے دیکھا ہے ترا دست حنا اندر سے

جب بھی چاہت سے پکاروں تو جواب آتا ہے
بولنے لگتا ہے خود میرا خدا اندر سے

ایک شب خواب میں دیکھا تھا مدینہ میں نے
تب سے آتی ہے مدینے کی ہوا اندر سے

صرف اقبال میں چہرے ہی نہیں پڑھتا ہوں
دیکھ لیتی ہے مری آنکھ وفا اندر سے

اقبال سروبہ

غزلیں

رہنے ہی دیجے رسم جہاں گیر کھینچنا
بے فائدہ ہے عدل کی زنجیر کھینچنا

اک زرد رُو کو دیکھتے ہی سہل ہو گئی
روٹھی ہوئی بہار کی تصویر کھینچنا

عمرِ عزیز خوابِ مسلسل میں کٹ گی
گویا ہے خواب، خواب کی تعبیر کھینچنا

اہلِ ہوس کا اب بھی ہے محبوب مشغلہ
تنہائیوں میں دامنِ تنویر کھینچنا

فرعون کے خیال سے یاد آ گیا مجھے
بگڑے ہوئے دماغ کی تصویر کھینچنا

کرتا ہے شاخِ سبز کے دل کو لہولہو
یک دم جھپٹ کے خوشۂ انجیر کھینچنا

لگتا ہے ان کو زہر بھی تریاق کی طرح
آتا ہے جن کو عطرِ عقاقیر کھینچنا

گردانتا ہوں میں اسے پرواز دردِ سر
بیٹھے بٹھائے رنجِ اساطیر کھینچنا

یعقوب پرواز

جس جگہ کوئی مقابل ہی نہیں
شہر وہ رہنے کے قابل ہی نہیں

اس ہمالہ سے ڈرے میری بلا
میرے رستے میں جو حائل ہی نہیں

جس کے باعث شہر ہے زار و زبوں
اس کی نظروں میں مسائل ہی نہیں

ہار کی خفت اُٹھاتے جائیں گے
پاس اپنے جب دلائل ہی نہیں

کون ماپے گا دلوں کے فاصلے
ان میں کوئی حدِ فاصل ہی نہیں

ایسا دل جو صورتِ سیماب ہو
اب کسی کے پاس وہ دل ہی نہیں

بسکہ ہے پرواز وہ جانِ جہاں
جب کوئی اس کا مماثل ہی نہیں

غزل

گھلا جاتا ہوں گہری روشنی میں
محبت کی سنہری روشنی میں

نظر میں بس گیا ہے رنگ اس کا
میں خوش ہوں اس اکہری روشنی میں

گجردم جیسے رکھ دی ہو کسی نے
گلابوں کی مسہری روشنی میں

پہاڑ اپنے اندھیرے سے بھرا ہے
کھڑی ہے اک گلہری روشنی میں

اجالا اور اجلا ہو گیا تھا
وہ اک لحظہ جو ٹھہری روشنی میں

اب اس کا فیصلہ تسلیم ہو گا
لگے گی جو کچہری روشنی میں

یہ سچ ہے نسبتاً ہے روشنی کم
تپش افزوں ہے شہری روشنی میں

واحد سراج

غزل

ہم ٹوٹنے نہ دیں گے رفاقت کے سلسلے
بڑھتے رہیں گے یونہی محبت کے سلسلے

وہ سرتا سر غزل ہے اسے گا رہا ہوں میں
جاری ہیں رات دن ہی ریاضت کے سلسلے

ٹھہرو ذرا رکو کہ توقف تو کچھ کرو
اب حد سے بڑھ گئے ہیں جراحت کے سلسلے

اب منصفین بھی ہیں یہاں مصلحت پسند
حیرت سے تک رہے ہیں عدالت کے سلسلے

زنجیریں ظلم و جور کی اب ٹوٹنے کو ہیں
شاہد ہیں اس پہ شوقِ شہادت کے سلسلے

اب تو نہیں ہے کوئی چراغوں کی ہم کو فکر
اب ہیں ہوا کے ذمہ حفاظت کے سلسلے

سارے تعلقات و مراسم بھلا کے لوگ
اب تو بڑھا رہے ہیں عداوت کے سلسلے

اے کوفیانِ شام ذرا غور سے سنو
نوکِ سناں پہ جاری تلاوت کے سلسلے

بیکار ہی گئیں مری سب کاوشیں جلیلؔ
اب بھی رُکے نہیں ہیں رقابت کے سلسلے

احمد جلیل

غزل

سعد اللہ شاہ

صد حیف سب سحاب بھی ثابت ہوئے سراب
پلکوں پہ ڈھل کے آ گئے سارے ہمارے خواب

ہم کتنے خوش گمان تھے اب جا کے یہ کھلا
گلدان میں تھے آپ کے سب کاغذی گلاب

آتے ہیں کس شمار میں ہم سے زمین زاد
اُترے ہیں آسمان سے بس آپ ہی جناب

قربان جائیں آپ کے اس اعتماد پر
اس جھوٹ کے تو سامنے سچ بھی ہے آب آب

ہوتی تھی اپنے ہاتھ ہی میں وقت کی لگام
بادل ہمارے ساتھ تھے اور چاند ہمرکاب

کرنا نہیں ہے مجھ کو نیا تجربہ کوئی
یعنی میں واپس آیا ہوں ہو کر بہت خراب

اے سعد کچھ کہو کہ کہاں ہے وہ آسمان
ٹانکے تھے جس پہ آپ نے مہتاب و آفتاب

غزل

وہ کیا کرے کہ جس کو ہوئی آگہی عذاب
اک پہلو خوبصورتی کا لے گیا حجاب

میرا شعور آئنہ ہے قال و حال کا
میرا مذاق اڑاتا ہے گزرا ہوا شباب

ملتی ہے کچھ نمود سی سب کو ہوا کے ساتھ
بندہ ہو یا غبارہ ہو یا پھر کوئی حباب

سچ تھا طلسمِ حسنِ زلیخا کے سامنے
یوسف پہ خود ہی کھلتے گئے سارے بند باب

غالب نے شہد کو جو کہا ہے مگس کی قے
محبوب سے ہو عشق تو اکسیر ہے لعاب

اترا خمار جاں تو کھلی چشمِ آشنا
پھر آئے میرے سامنے سارے گنہ ثواب

جب دل مرا کتاب کی دنیا سے پھر گیا
تب جا کے میرے دل کو لگی سعد الکتاب

سعد اللہ شاہ

غزل

رات کی تنہائی میں یوں دور گاتا کون ہے
گیت میرے اپنی لے میں گنگناتا کون ہے

رات کے پچھلے پہر میری کتابِ زیست کو
کھولتا ہے، بیٹھ کے پڑھ کے سناتا کون ہے

جو مجھے آیا تھا ملنے دل میں بس کر رہ گیا
پھر یہ دروازے سے باہر جاتے جاتا کون ہے

جذب ہو جاتا ہے میری روح میں پوچھے بنا
اور میرے جسم میں بھی سرسراتا کون ہے

کہہ بھی دیتا ہوں تخل کوئی نہ ہو تنہائی میں
بے جھجک کمرے میں پھر بھی یوں در آتا کون ہے

گر بھی پڑتا ہوں اگر میں خواب میں ثاقب کبھی
اک ہیولا سا مجھے آ کر اٹھاتا کون ہے

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم غلط ہیں کہ غلط سمت میں چل دیتے ہیں
ورقِ خاک پہ کیوں خاک سے تحریر ہُوے

غزلیں

اسی لیے تو ہمیں زیست اب کے راس نہیں
ترا خیال بھی جب دل کے آس پاس نہیں

دلوں میں پلتی رہی ہیں کدورتیں ایسی
کہ اہلِ شہر کے لہجوں میں وہ مٹھاس نہیں

تری وفا بھی غنیمت ہے اس جہاں میں، مگر
جیے وہ خاک، جسے زندگی کی آس نہیں

وہ شہر یار، سزاوارِ شہر یاری کہاں
غریبِ شہر کے تن پر اگر لباس نہیں

مرے سخن کی حقیقت، کھلے گی کیا اس پر
جو فتنہ ساز، ذرا بھی سخن شناس نہیں

مرے دکھوں کی کہانی، عیاں ہے چہرے سے
کہوں میں لاکھ، پریشاں نہیں، اداس نہیں

خدا نے دولتِ صبرِ جمیل دی ہے اسے
غموں کی رت میں بھی شوکت جو محوِ یاس نہیں

شوکت محمود شوکت

متاعِ کارواں لٹنے کا جس کو غم نہیں کوئی
کرے پھر اس کی باتوں پر بھلا کیسے یقیں کوئی

مکانِ دل، مثالِ دشتِ ویراں خوب ویراں ہے
کہ ہم نے آج تک دیکھا نہیں اس میں مکیں کوئی

سمندر پھر سمندر ہے، سفینے غرق کرتا ہے
سمندر سے لڑے تو کیا لڑے صحرا نشیں کوئی

زباں کو ذائقوں کی اس طرح پہچان ہوتی ہے
کہ یہ زہرِ ہلاہل ہے تو ہے وہ انگبیں کوئی

محبت کرنے والوں کی طبیعت میں ہے بے تابی
تڑپتا ہے کہیں کوئی تو مرتا ہے کہیں کوئی

لبادہ، چاندنی نے یوں، جو اوڑھا ہے اداسی کا
مقابل، ماہِ کامل کے، ہے شاید مہ جبیں کوئی

کسی کو کس لیے چاہیں، قصیدہ کس لیے لکھیں
نگاہوں میں، جچا ہی جب نہیں شوکت حسیں کوئی

غزل

عشق کی آن دیکھتے رہنا
حسن کی شان دیکھتے رہنا

چاند آئے گا دیکھنے تجھ کو
تم مری جان دیکھتے رہنا

کتنے چہرے ہیں ایک چہرے پر
ہو کے حیران دیکھتے رہنا

مجھ کو تو لوٹ کر نہیں آنا
میرا سامان دیکھتے رہنا

پنچھی آئیں گے شام ہوتے ہی
اپنا دالان دیکھتے رہنا

خواب کیا خواب کی حقیقت کیا
آنکھ ویران دیکھتے رہنا

تیری باتوں میں آ گیا ہے دل
دل ہے نادان دیکھتے رہنا

دیکھنا ہے اگر زمانے کو
بن کے انجان دیکھتے رہنا

ابر بن کر یہ پیار برسے گا
ہے یہ امکان دیکھتے رہنا

آغا نثار

غزلیں

مرے وجود سے فارغ کیا گیا مجھ کو
پھر اعتماد میں کیسے لیا گیا مجھ کو

میں اس فصیل سے باہر نکل تو آتا مگر
مری زبان کے اندر سیا گیا مجھ کو

پھر اس سے کیسے جلاتا میں کوئی اور چراغ
دیا جلا کے ہوا میں دیا گیا مجھ کو

تبھی تو اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی
میں مر گیا تو مزے سے جیا گیا مجھ کو

مسعود احمد

جن لاشوں پر جینے کا الزام بھی تھا
ان کی صف میں شامل میرا نام بھی تھا

تجھ سے مل کر جب بھی واپس لوٹا ہوں
یاد آیا کہ تجھ سے کوئی کام بھی تھا

پھر وہ میری خاک بچھا کر لیٹ گیا
شاید میرا قاتل بے آرام بھی تھا

ہم تو لکھ کر ناحق ہی بدنام ہوئے
جن باتوں کا ویسے چرچا عام بھی تھا

قحط کی آفت سارا گاؤں چاٹ گئی
اس گاؤں میں غلے کا گودام بھی تھا

پھر ایک دشت نمودار ہو گیا مجھ میں
میں ایک دریا تھا کیسے پیا گیا مجھ کو

میں اپنے قد سے بڑا ہونا چاہتا تھا مگر
مرے وجود سے چھوٹا کیا گیا مجھ کو

کوئی بھی چاند چڑھایا نہیں گیا مجھ سے
اگرچہ ہاتھ میں سورج دیا گیا مجھ کو

بستی کیا تھی صرف سرائے عبرت تھی
شہر کا۔شہر وہ شرم کا ایک مقام بھی تھا

لوگ مجھے دیوانہ وار رگڑتے تھے
میرے اندر شاید ایک غلام بھی تھا

رستے میں موجود خلیجیں نفرت کی
میرے پاس محبت کا پیغام بھی تھا

غزل

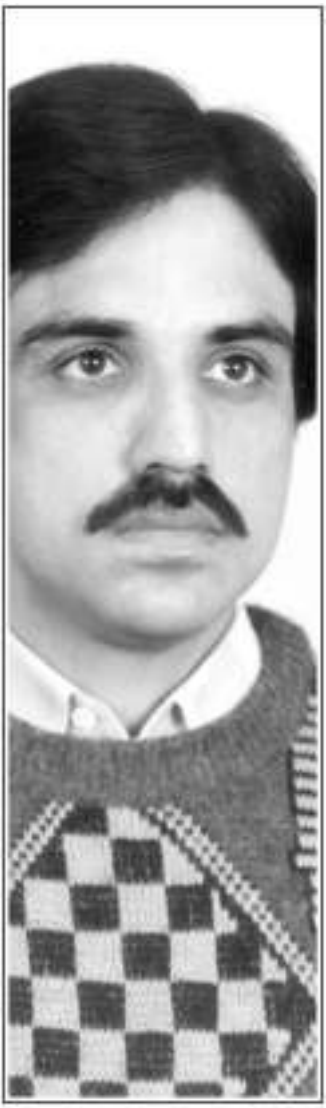

نہ پوچھو مجھ سے ، کیونکر چاہیے تھا
مجھے بس دیدۂ تر چاہیے تھا

میں تیرے ساتھ رہ کر معتبر ہوں
کنارے کو سمندر چاہیے تھا

مجھے سائے کی حاجت تو نہیں تھی
مجھے دیوار میں در چاہیے تھا

فلک سا چاہیے تھا ظرف یا رب
ستاروں سا مقدر چاہیے تھا

مجھے کافی تھی تیری بے نیازی
تجھے کچھ اس سے بڑھ کر چاہیے تھا

گدا پر مہرباں ہوتا بھی کیسے
مقدر کو سکندر چاہیے تھا

تقاضا وصل کا کس نے کیا تھا؟
مجھے تو ہجر دم بھر چاہیے تھا

وہ خود اک خواب بن کر رہ گیا ہے
جسے خوابوں کا پیکر چاہیے تھا

لیے پھرتا ہے برگِ خشک جمشید
ہواؤں کو بھی رہبر چاہیے تھا

جمشید چشتی

غزل

گوشۂ عزلت میں خود کو آزمانا آ گیا
ساتھ دینے چھوڑ جانے کا بہانا آ گیا

روٹھ جائے بخت جب پھر مانتا ہرگز نہیں
ہاں مگر اتنا ہوا اس کو منانا آ گیا

میری رسوائی جنھیں منظور تھی وہ خوش ہوئے
بے بسی کا ہاتھ ان کے اک فسانہ آ گیا

خود سے تنہائی میں اتنی بات ہوتی ہے کہ اب
ہر طرح باتیں بنانا اب کہا نا آ گیا

خود پہ اک پل بھی نظر جاتی نہیں اور یہ کہیں
کیا ہوا لوگوں کو آخر کیا زمانہ آ گیا

روشنی اندر نہ ہو تو کل جہاں تاریک ہے
شکر ہے کہ اب مجھے جگنو بنانا آ گیا

اس تواتر سے گرے ہیں زندگی کی دوڑ میں
گرتے لوگوں کو بچانا اور اٹھانا آ گیا

بے رخی نے اس کی ایسا کر دیا پکا عظیمؔ
غیر کی محفل میں اب تو آنا جانا آ گیا

ابن عظیم فاطمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

یہ اور بات کسی کو گماں نہیں ہوتا
جہاں میں ہوتا ہوں اکثر وہاں نہیں ہوتا

وہ بدنصیب پرندے ہیں ہم کہ جن کے لیے
کسی شجر پہ درِ آشیاں نہیں ہوتا

لگی ہوئی ہے مرے تن بدن میں ایسی آگ
کہ راکھ گرتی ہے لیکن دھواں نہیں ہوتا

عدالتیں ہوں مساجد ہوں یا کوئی بازار
یہاں ضمیر کا سودا کہاں نہیں ہوتا

مجھے پسند ہے چاہے کسی حوالے سے
ہو میرا ذکر وہاں میں جہاں نہیں ہوتا

زمین کیسی نظر آتی سوچ سکتے ہو
ہمارے سر پہ اگر آسماں نہیں ہوتا

ملا کے مٹی میں اک روز چھوڑتے ہیں لوگ
سدا قیام کسی کا یہاں نہیں ہوتا

کسی کسی پہ برستی ہیں بدلیاں راحتؔ
سبھی پہ موسمِ گل مہرباں نہیں ہوتا

راحت سرحدی

غزل

زندگی لمحے کو کترائی ہے بس
پھر بھی اندر سے صدا آئی ہے۔ بس!

میری تو جان ہی لے لی جس نے
اُنہیں وہ بات پسند آئی ہے بس

نہ تمنا ہے نہ اندیشہ ہی
بجھتی آنکھوں میں شناسائی ہے بس

جوق در جوق سبھی ڈھونڈتے ہیں
اِک ذرا سی کہیں تنہائی ہے بس

ایک ٹھوکر سے سرک جائے گی
فکر کس بات کی؟ دانائی ہے بس

چاک داماں ہوا جاتا ہے فلک
ہم نے جھولی ابھی پھیلائی ہے بس

جانے کب کس نے گزاری ہے کہاں
ہم نے تو زندگی دہرائی ہے بس

دوست میں شعر نہیں شاعر ہوں
بات سمجھی نہیں سمجھائی ہے بس

حسنین سحرؔ

غزل

واصف سجاد

گر کوئی جستجو نہیں ہو گی
زندگی سرخرو نہیں ہو گی

وہ جہاں بھر نے رنگ دکھلائے
خواہشِ رنگ و بو نہیں ہو گی

کون کہتا ہے تیری باتوں سے
روشنی چار سو نہیں ہو گی

منزلیں آئیں گی نظر لیکن
پھر ہمیں آرزو نہیں ہو گی

اور ہوں گے مسائلِ دنیا
جی کا آزار تو نہیں ہو گی

آج پڑھتے ہیں وقت کا لکھا
شعر پر گفتگو نہیں ہو گی

ہے کوئی صاحبِ جمال جسے
خود پسندی کی خو نہیں ہو گی

غزل

کیسے قرطاس پہ لاؤں میں جمالِ خُوش رُو
چاند، تارے نہ کوئی پُھول، مثالِ خُوش رُو

سچ تو یہ ہے کہ مرے دل کی عجب حالت ہے
کوئی خواہش ہے نہ امیدِ وصالِ خُوش رُو

دھیرے دھیرے سے رہِ عشق میں رفتار بڑھا
راکبِ بادِ خیالِ خدوخالِ خُوش رُو

میں تو اب سختیٔ حالات سے گھبراتا نہیں
میرا تریاقِ غمِ دہر ، خیالِ خُوش رُو

میں نے بس مشقِ سخن کے لیے لکھا میثم
اور غزل ہوگئی منسوبِ غزالِ خُوش رُو

میثم نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اَے دیارِ وصالِ یار ، بتا
ہجر کِس آستاں سے ملتا ہے

غزل

ٹوٹے دلوں کا دستِ دعا کیسے بنوں گا
میں سوچ رہا ہوں کہ خدا کیسے بنوں گا

گلیاں ہیں مرے چار طرف اور وہ بھی بند
ٹکراؤں گا کب تک، مَیں ہَوا کیسے بنوں گا

اپنا ہی مجھے ٹھیک سے گھر یاد نہیں ہے
میں گمشدوں کے گھر کا پتہ کیسے بنوں گا

پھل دار شجر بن نہ سکا عمرِ رواں ! مَیں
تو اپنے قبیلے کا بڑا کیسے بنوں گا

اے دوست! ابھی سہنے پڑیں گے مجھے پتھر
میں ورنہ پہاڑ اپنی جگہ کیسے بنوں گا

اِس بار پلٹ کر ہی نہیں آئی کہیں سے
اِس بار ظہور اپنی صدا کیسے بنوں گا

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے ہونٹوں پہ ہے سب کے دل کی
ڈھونڈیے اپنے ہی اندر مجھ کو

غزل

منظور ، دردِ عشق کا دل پہ اثر تو ہو
لیکن علاج کے لئے اک چارہ گر تو ہو

مرنے کا کیا ہے میں ابھی مر سکتا ہوں، مگر
کوئی تو سوز خواں ہو کوئی نوحہ گر تو ہو

میں تیرے دل سے کیسے نکل جاؤں یہ بتا
رہنے کو میرے پاس کوئی اور گھر تو ہو

کر دوں گا اپنے پیار کا اظہار اس سے میں
لیکن ذرا سا اس کی توجہ ادھر تو ہو

وہ خود کو بیچ دے گا یقیناً مرے لئے
میری پریشاں حالی کی اس کو خبر تو ہو

تب ہی تو معنیٰ خیز بنے گی سفر کی دھوپ
راہوں میں سایہ دار کوئی اک شجر تو ہو

دنیا کا کوئی خوف نہ رہ جائے گا تمہیں
پیدا دلوں میں خالقِ اکبر کا ڈر تو ہو

ذکی طارق

غزل

تجھ سے ملنے کی تو تیاری نہیں کرنی ہے
پیار کرنا ہے اداکاری نہیں کرنی ہے

ترا کچھ نام پتہ ہو تو بتانا مجھ کو
مجھکو اس شہر میں اب خواری نہیں کرنی ہے

اپنے دشمن کو بھی دھوکا نہیں دینا میں نے
اپنے یاروں کی طرفداری نہیں کرنی ہے

میں کسی روز ترے شہر میں آ جاؤں گا
تجھ سے ملنے میں سمجھداری نہیں کرنی ہے

اپنی غزلوں میں ترا ذکر بھی لا سکتا ہوں
میں نے غم ناک صدا کاری نہیں کرنی ہے

عشق ہونے کا تماشا نہیں کرنا شاہد
عشق میں ایسی عزاداری نہیں کرنی ہے

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پلکوں کی ہتھیلیوں پہ خالد
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

غزل

خود میں اک تیز خریدار لیے پھرتا ہوں
اس لیے جیب میں بازار لیے پھرتا ہوں

جس حسیں خواب سے آباد ہے دنیا میری
دکھ تو یہ ہے اسے بے کار لیے پھرتا ہوں

دھوپ حیرت سے مجھے دیکھ رہی ہے صاحب
جسم میں سایۂ دیوار لیے پھرتا ہوں

اپنے ہی شہر میں پہچان نہیں ہے میری
اجنبی شخص کا کردار لیے پھرتا ہوں

ایک آزار نہ ہونے کا مرے اندر ہے
ساتھ ہونے کا بھی آزار لیے پھرتا ہوں

لوگ اک اور زمانے کی خبر چاہتے ہیں
اور میں آج کا اخبار لیے پھرتا ہوں

اس جگہ کوئی کسی کی نہیں سنتا اسحاق
میں جہاں خواہشِ گفتار لیے پھرتا ہوں

اسحاق وردگ

غزلیں

اب کہاں ہیں وہ چاہنے والے
مہرباں بن کے لوٹنے والے

لذتِ خواب ہی بھلا بیٹھے
ہجر میں تیرے جاگنے والے

کب فراموش ہو سکا مجھ سے
اے مرے دل کو توڑنے والے!

آیتِ عشق کا جو ورد کیا
لوٹ آئے ہیں روٹھنے والے

تیرے آنگن میں نت بہاریں ہوں
میرے دکھ کو سمیٹنے والے

کس کا چہرہ تجھے نظر آیا
دل کے آنگن میں جھانکنے والے

اب کیوں آئے ہیں لوٹ کر فرخ
راہ میں ساتھ چھوڑنے والے

سید فرخ رضا ترمذی

میں نے تو تم سے سچ بیانی کی
تم نے کیوں مجھ پہ بدگمانی کی

میری برباد زندگانی کی
تم نے سب سے بیاں کہانی کی

آگئیں ، مجھ کو دیکھ کر تنہا
تیری یادوں نے مہربانی کی

زخم بخشے ہیں تو نے ایسے مجھے
اب ضرورت نہیں نشانی کی

مرتے دم تک تجھے ہی چاہا ہے
اپنے وعدے کی پاسبانی کی

خوف کھایا نہیں ہے ظالم سے
سرِ دربار حق بیانی کی

حالِ دل جب نہ کہہ سکا فرخ
میرے اشکوں نے ترجمانی کی

غزل

سیر نامہ ہے بیکرانی کا
جس میں گم ہے افق معانی کا

باغ عبرت میں کوئی آتا نہیں
رنگ اُڑنے لگا نشانی کا

رنج رکھتے ہیں تیرے خانہ بدوش
بے گھری کا ، نہ لا مکانی کا

پھیلتا ہے ، بڑا نہیں ہوتا
سایہ دیوار مہربانی کا

ہو رہا ہے کئی زبانوں میں
ترجمہ میری بے زبانی کا

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تیرے پیکر کی شعاعیں میرے فن کا رنگ ہیں
ہُو بہو اک دن تری تصویر ہو جاؤں گا مَیں

غزل

حاصلِ عشق کا ہر روز تماشا نہ کریں
لوگ تو لوگ ہوئے آپ تو ایسا نہ کریں

اپنا اسلوبِ سخن پاس ہی رکھیں اپنے
جب کوئی شعر پڑھے بیچ میں ٹوکا نہ کریں

اک ذرا غور کریں میری حکایت ہی جناب!
جلد بازی میں مری سوچ کا سودا نہ کریں

یاد ماں باپ کی آخر میں بڑی آئے گی
اپنے ماں باپ کی ہر چیز کو بیچا نہ کریں

یہ نہ ہو نظمِ زمانہ میں خلل پڑ جائے
محترم! یوں کسی درویش کو چھیڑا نہ کریں

آپ کے بس میں نہیں بات محبت والی
بس کریں آپ محبت کی تمنا نہ کریں

شرم سے خود میں سمٹ جاتا ہے وہ حسنِ غزال
سو گزارش ہے اسے غور سے دیکھا نہ کریں

سہیل احمد صمیم

غزل

جام میں تھے عذاب انگارے
دے گئی ہے شراب انگارے

عمر بھر کا حساب انگارے
زندگی کا نصاب انگارے

جل کے ساری زمین راکھ ہوئی
دے گیا آفتاب انگارے

بادلوں سے بھی آگ برسی ہے
لگ رہا ہے سحاب انگارے

تتلیاں جل کے مر گئیں ساری
شاخ پر ہیں گلاب انگارے

آج کا احتساب انگارہ
آج کا انقلاب انگارے

فصل شعلوں کی کاٹنی ہو گی
بوئے ہیں بے حساب انگارے

میری پلکیں بھی جل گئی ہیں عقیلؔ
بن گئے سارے خواب انگارے

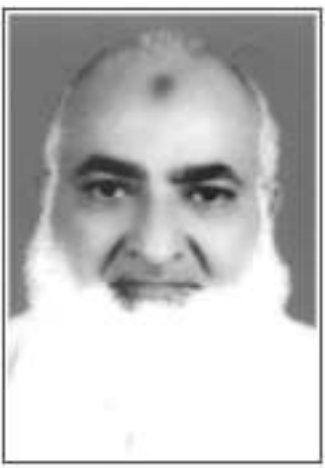

عقیل رحمانی

غزل

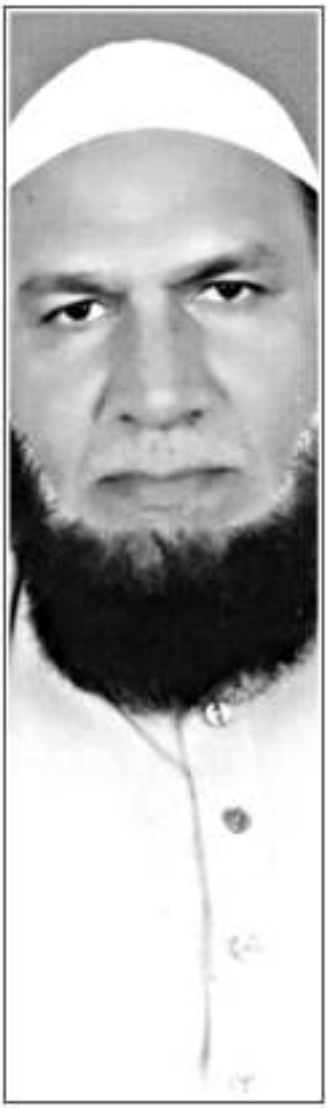

دیکھنے اس کو کسی اور بہانے سے گئے
لوٹ آئے تو کھلا ہوش ٹھکانے سے گئے

اس کو چھوڑا تو رہِ عشق و ہنر کو چھوڑا
ایک کیا اُس سے گئے گویا زمانے سے گئے

ٹھیس پہنچی جو انا کو تو چمن چھوڑ دیا
لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس کے اُٹھانے سے گئے

بے سبب روٹھ گئے کانچ کے نازک پتلے
بات کرنے سے گئے شکل دکھانے سے گئے

خونِ دل خونِ جگر دے کے جنہیں سینچا تھا
ہائے وہ باغ بھی اب پھول کھلانے سے گئے

تم پہ الزام نہیں بخت میں یہ ہجرت تھی
تیری بستی سے نہیں تیرے ستانے سے گئے

اس کو دیکھا تو رضاؔ ایک تحیر میں رہے
آہیں بھرنے سے گئے اشک بہانے سے گئے

رضا اللہ حیدر

غزل

جس کو چاہا ہے وہ ملا ہی نہیں
کوئی میری طرح لُٹا ہی نہیں

خامشی بات کر رہی ہے مری
میں نے لب سے تو کچھ کہا ہی نہیں

آنسوؤں سے لکھی غزل میں نے
ہجر اُس کا جُدا ہوا ہی نہیں

کس سے اب پوچھوں حالِ دل اُسکا
اس نے اپنا پتہ دیا ہی نہیں

میں نے کتنے ٹھکانے بدلے تھے
موت سے پھر بھی میں بچا ہی نہیں

کسقدر یاد کا اثاثہ ہے
میں نے یکجا جسے کیا ہی نہیں

جس کے برسوں سے خواب دیکھے تھے
اُس کی آنکھوں میں مَیں بسا ہی نہیں

گھر سے رخصت ہوئے بڑے جب سے
تب سے دامن میں کچھ رہا ہی نہیں

اُس کے پہلو میں سانپ ہے یا دوست
یہ کسی کو پتہ چلا ہی نہیں

مال و دولت بہت ہے اُس کے پاس
گر نہیں ہے تو اک وفا ہی نہیں

عشق کا دائمی مریض ہوں میں
اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

اُس نے طاہر کیا ہے مجھ سے گریز
ایسا پہلے کبھی ہوا ہی نہیں

طاہر ناصر علی

غزل

رخشندہ نوید

اپنے دل کے بوجھ کو بھاری نہیں ہونے دیا
میں نے خود پر عمر کو طاری نہیں ہونے دیا

بھر گیا تھا رنگ مجھ میں برسوں پہلے ایک عشق
حسن سے چہرے کو پھر عاری نہیں ہونے دیا

اک نئی منزل کی جانب پھر مچل کر چل پڑی
دکھ کی بارش کو بھی لاچاری نہیں ہونے دیا

میں نے ہر ساعت بچھائی تھی بساطِ آرزو
لمحۂ فرصت کو بیکاری نہیں ہونے دیا

بس وہی ہستی وہ تیری ماں کہ جس نے عمر بھر
تجھ پہ اوروں کو کبھی واری نہیں ہونے دیا

مجھ کو خود پر ضبط تھا اتنا کہ رخشندہ کبھی
آنسوؤں کا سلسلہ جاری نہیں ہونے دیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نظر نظر میں ہزاروں سوال ہیں لیکن
فلک سے کوئی مری سمت دیکھتا بھی تو ہو

غزلیں

رات گزری نہ آنکھ بھر سوئے
ہم کہاں تجھ کو بھول کر سوئے

دو جہانوں میں برسرِ پیکار
ایک پہلو سے بے خبر سوئے

ہم سگِ کوئے یار اپنے تئیں
غفلتی ہو کے در بدر سوئے

نوعِ انساں کی بے بسی دیکھو
نیند آتی نہ تھی مگر سوئے

چھوڑ خوابوں کے رنگیں بستر
جانے سب کیوں اِدھر اُدھر سوئے

باغ کے پہرے دار آئے کئی
اور اُن میں سے بیشتر سوئے

ہجر بیگار کا سمے کس کو
دن کے مصروف رات بھر سوئے

زندگی ، سب ترے تھکائے ہوئے
آخرش خاک اوڑھ کر سوئے

صائمہ آفتاب

سنبھل سنبھل کے وہ طے گام گام کر رہا ہے
سہج سہج کے تعلق پہ کام کر رہا ہے

دیے جلاتا ہوا ، گھنٹیاں بجاتا ہوا
بڑے ہی چاؤ سے اک بت کو رام کر رہا ہے

یہ آسمان ، یہ بے انتہا اداسی دیکھ
ستارہ وار یہاں غم خرام کر رہا ہے

یہ وقت باغ مہکنے کا ہے ، جگاؤ اسے
جو شخص خواب سرا میں قیام کر رہا ہے

سپر دِ غیر نہ کر دوں میں اسکے دن جواب
کسی کے ساتھ بسر میری شام کر رہا ہے

محبتوں میں تو ہٹ دھرمیاں نہیں چلتیں
سو ایسا کر کے وہ قضہ تمام کر رہا ہے

ماہنامہ بیاض، جولائی 2022 کے شمارہ میں [صائمہ آفتاب] کی تصویر کے بجائے سہواً [صائمہ اسحاق] کی تصویر شائع ہوگئی تھی۔
[ادارہ معذرت خواہ ہے۔]

غزل

سورج کے ساتھ گھر سے نکلنا پڑا مجھے
دن بھر فراقِ یار میں جلنا پڑا مجھے

جب زندگی میں کوئی سہارا نہ بن سکا
پھر یوں ہوا کہ خود ہی سنبھلنا پڑا مجھے

چلنا پڑا مجھے بھی نئے دوستوں کے ساتھ
دیرینہ دوستی کو بدلنا پڑا مجھے

چاہت کہوں میں اس کو یا دیوانہ پن کہوں
کھلنے سے پہلے گل کو مسلنا پڑا مجھے

جو خواہشوں کی موت کا باعث بنا رہا
وہ زندگی کا زہر اگلنا پڑا مجھے

جب مجھ کو اپنی ذات کا عرفان ہو گیا
آخر خیالِ یار میں ڈھلنا پڑا مجھے

وہ آفتاب جب مرے اندر اتر گیا
دانش مثالِ برف پگھلنا پڑا مجھے

اعجاز دانش

غزلیں

ہے مجھے صحن میں اُٹھتی ہوئی دیوار کا دُکھ
یہی دیوار کا دکھ ہے میرے گھر بار کا دُکھ

اُنگلیاں کٹ گئیں فنکار کی خاموشی سے
کیا سنا ہے کبھی تم نے کسی معمار کا دُکھ

پھر وہ زندانِ محبت سے کہاں جائے گا
کوئی سمجھا ہی نہیں تیرے گرفتار کا دُکھ

وہ خزاں رُت میں ہواؤں سے اُجڑتے پتے
کوئی سمجھا ہی نہیں ہے مرے اشجار کا دُکھ

میں تو خاموش تھا خاموش چلا آیا تھا
لیکن اس کو تو ستاتا رہا تکرار کا دُکھ

سب کی نظروں میں تھیں وہ خوں میں نہاتی لہریں
اور مخفی تھا ہر اک آنکھ سے اُس پار کا دُکھ

جب سے بچھڑا ہے عجب دل میں ہے ویرانی سی
میری تنہائی کو بھی ہے در و دیوار کا دُکھ

طلعت شبیر

گونجتی ہے چار سُو
تیری میری گفتگو

میں پھر ہوں گو بہ گو
مجھ کو اپنی جستجو

ہر گھڑی تیرا گماں
لمحہ لمحہ تو ہی تو

سونی گلیاں خامشی
بستیوں کی ہاؤ ہو

ہے عیاں اک سلسلہ
اک جہانِ رنگ و بو

سردیوں کی رات ہے
چاند میرے روبرو

جاگتا ہے آنکھ میں
ایک شہر آرزو

غزل

رتجگوں کے دور میں ہے نیند کا گمان کیا
خواہشوں کی بستیوں میں پھر نیا مکان کیا

گھل گیا ہے زہر کیوں پھر آپ کی زبان میں
پک گئے ہیں شہد کے تمام مرتبان کیا

دل نہیں ہیں دور جب تو کس لیے ہے فاصلہ
آ گیا ہے پھر کوئی ہمارے درمیان کیا

آندھیاں ہیں زور کی مرا چراغ بچ گیا
تُو بتا ملے گی آج اس کو یہ امان کیا

وہ جو چھوڑ کر گیا سُنا ہے وہ بشر ہی تھا
ختم ہوگیا یہاں یہ آپ کا جہان کیا

زینتِ چمن نہیں گلوں میں بھی مہک نہیں
ہو گئے ہیں بے خبر تمام باغبان کیا

تصور اقبال

غزل

چاند تاروں میں گھر دیے جائیں
سب کو روشن نگر دیے جائیں

منزلیں اُن کے نام کی جائیں
مجھ کو دھندلے سفر دیے جائیں

جن میں پرواز کی نہیں طاقت
ان پرندوں کو پَر دیے جائیں

کاٹتے ہیں جو رات سڑکوں پر
کاش اُن کو بھی گھر دیے جائیں

دیں کی خاطر چلے جو کربل کو
اُس کے رستے پہ سر دیے جائیں

شعر کہتا رہوں روانی سے
مجھ کو ایسے ہنر دیے جائیں

لے کے جائیں جو مجھ کو رفعت پر
مجھ کو شاہد وہ پَر دیے جائیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

یونہی چلتے چلتے پھر تصویر بنائی سائے کی
ہمراہی تھی میری، میرے دل کو بھائی سائے کی

بے مقصد بھی گھوموں، میرا ساتھ نبھائے پورا وہ
کتنی اچھی عادت ہے منہ بولے بھائی، سائے کی

سیلفی لے کر حیرانی سے اس کو دیکھا سائے نے
میری شکل مکمل تھی تصویر میں آئی سائے کی

میرا عشق اکیلے کا ہے، سایہ بھی کب شامل ہے
اپنی اس تاویل پہ، میں نے سنی دہائی سائے کی

عشق مکمل، کب ہوتا ہے، ہر پل نیا جہان ملے
آنکھیں موندوں، سوچوں پر دارائی چھائی سائے کی

جیون خواب زدہ ہے لیکن میں نے سدا انیسؔ احمد
دھوپ میں جینا سیکھا، کبھی نہ آس لگائی سائے کی

انیس احمد

غزل

آپ مشکل میں سفینے کی طرف دیکھتے ہیں
اور ہم لوگ مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

میں نے اس واسطے شجرہ نہیں پوچھا تم سے
دیکھنے والے قرینے کی طرف دیکھتے ہیں

کم شناسوں نے ہی مٹی میں ہمیں رول دیا
جوہری ہوں تو نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

وقتِ رخصت کا وہ منظر ہے بسایا دل میں
یاد آتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اس کے آنے کی خبر جب سے سنی ہے ہم نے
دن، گھڑی اور مہینے کی طرف دیکھتے ہیں

وہ کہ مزدور کی اُجرت نہیں کھاتے ارشدؔ
لوگ جو بہتے پسینے کی طرف دیکھتے ہیں

ارشد محمود ارشد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہی بھائی، وہی بھاؤ، وہی قدریں خالد
کیا توقّع کوئی لے کر سر بازار آئے

غزل

یہ کیا کہ آج مخمصے دل میں عیاں سے ہیں
آثار ہو بہ ہو کسی سیلِ رواں سے ہیں

احباب جن کے ساتھ گزاری تھی زندگی
اب وہ خیال وخواب میں وہم وگماں سے ہیں

پت جھڑ سے استوار رہے ہیں بہار میں
گُل سے تعلقات بھی دورِ خزاں سے ہیں

مدت سے ایک آس کو جنبش نہیں ہوئی
میرے سیاہ بخت بھی کوہ گراں سے ہیں

جانا اگر ہے اِن کو نئی منزلوں کی اور
یہ بھی تو پوچھیے کہ یہ آئے کہاں سے ہیں

مر کے بھی عابدی کو مفر ہو کہاں جناب
دن رات زندگی کے کسی امتحاں سے ہیں

علی حسین عابدی

غزلیں

درد و غم کا علاج کیسے ہو
چاہتوں کا رواج کیسے ہو

کل تو جو حال بھی تمھارا تھا
یہ بتاؤ کہ آج کیسے ہو

فرصتِ زندگی نہیں ہم کو
پھر بھلا کام کاج کیسے ہو

یہ بھی حِصہ ہے زندگانی کا
ختم آخر سماج کیسے ہو

اِتنی مہنگائی میں بھلا سوچو
گھر میں وافر اَناج کیسے ہو

ہم کو عزّت' ندیم! ہے درکار
سر پہ شہرت کا تاج کیسے ہو

ریاض ندیم نیازی

دنیا میں دشت ہیں تو چمن زار کم نہیں
یاروں کی بات ہو تو مرے یار کم نہیں

کم نسل بے وفائی سے آتے نہیں ہیں باز
اور اصل دوستوں میں وفادار کم نہیں

ناکارہ دوستوں کی کوئی قدر ہی نہیں
اور جاں نثار ہوں تو خریدار کم نہیں

اوقات جو دکھاتے ہیں کم ظرف لوگ ہیں
اور اعلیٰ ظرف کے لیے گل زار کم نہیں

الزام جو لگاتے ہیں آتی ہے اُن سے باس
اور پارساؤں کے لیے مہکار کم نہیں

نیکی بھی مانتے ہیں تو کرتے ہیں نیک کام
اُن کے لیے ثواب کے انبار کم نہیں

ہیں اچھے دوست جان چھڑکتے ہیں دوست پر
اُن دوستوں کے واسطے دربار کم نہیں

کرتے نہیں برائی کسی دوست کی جو یار
اُن سچے موتیوں کی تو جھنکار کم نہیں

مہر و وفا' خلوص لُٹا اُن پہ اے ندیم
ہیرے مثال ہیں وہ گُہر بار کم نہیں

غزل

فقط صورت گری ہے میں نہیں ہوں
یہ بس تصویر سی ہے میں نہیں ہوں

مصور کے تصور کی سراسر
یہ سب جادوگری ہے میں نہیں ہوں

عبث مجھ کو مٹانے پر تلے ہو
حقیقت کھول دی ہے میں نہیں ہوں

جسے تم ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہو
وہ میری نیستی ہے میں نہیں ہوں

کرو ضائع نہ پتھر ، تیر مجھ پر
ہیولا عارضی ہے میں نہیں ہوں

حسد مجھ سے یہ کیسا ہے عزیزو
عروجِ سرسری ہے میں نہیں ہوں

میں جو کہہ دوں ، سمجھ لیں لوگ جو بھی
لیکن سچ یہی ہے میں نہیں ہوں

تعارف کیا تمہیں اپنا کراؤں
پتہ میرا یہی ہے میں نہیں ہوں

کسی کے ہاتھ میں ہے ڈور میری
یہ پُتلی ناچتی ہے میں نہیں ہوں

مرے فکر و عمل میرے نہیں ہیں
عجب دھوکہ دہی ہے میں نہیں ہوں

"اناالحق" ساز کا پردہ ہے جس میں
قیامت بولتی ہے میں نہیں ہوں

یہی پہلا سخن فیضانؔ حق ہے
یہی بات آخری ہے میں نہیں ہوں

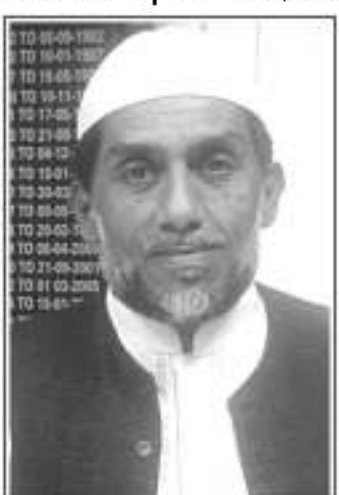

فیض رسول فیضان

غزل

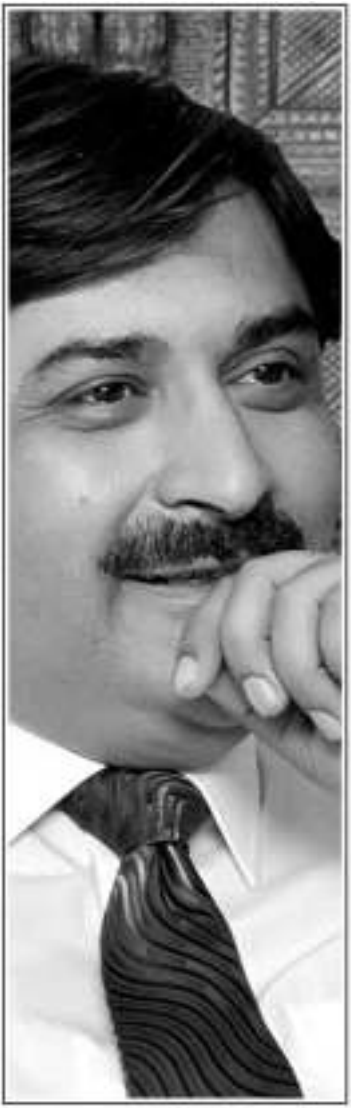

میری طَرَف سے عام مُعافی ہے میرے یار!!
تُجھ کو حَسَد کی آگ ہی کافی ہے میرے یار!!

جَب کَہہ دیا کہ پیار ہے تو مان لو نا تُم
اِس بات کا ثُبوت اِضافی ہے میرے یار!!

سَمجھے گا کون تیری یہ تَہہ دار گُفتگُو
تیری ہَر ایک بات غِلافی ہے میرے یار!!

مُشکِل ہے پُل صِراط مگر اُس سے پیشتر
اِک مَرحلے کا نام مُکافی ہے میرے یار

کُچھ اور تُم کو سَمجھوں ضَرُورَت نہیں رَہی
جِتنا سَمجھ چُکا ہوں وہ کافی ہے میرے یار!!

جَب کَہہ دیا کہ تُم ہی کَرو گے عِلاجِ غَم
اَب زَہر بھی پِلاؤ تو شافی ہے میرے یار!!

دانِش کی بات مان لُوں، دانِش کی بات ہے؟
میرے مِزاج کے یہ مُنافی ہے میرے یار!!

دانش عزیز

غزلیں

اِک نئے باب کا آغاز ہوا چاہتا ہے
اِک ستارہ مرا ہمراز ہوا چاہتا ہے

دوستا! مان لے اب تو مرا ہونا خود میں
اب تو دشمن مری آواز ہوا چاہتا ہے

اب یہاں میرا ٹھہرنا نہیں ممکن لگتا
تیرا دل دعوتِ شیراز ہوا چاہتا ہے

جو سمجھتے تھے اِسے کارِ زیاں ان کے لیے
شعر گوئی مرا اعزاز ہوا چاہتا ہے

گا رہا ہوں مَیں محبت کے ترانے دل سے
ایک عالم مرا دَم ساز ہوا چاہتا ہے

اس کو ہونے لگی محبوب مسیحائی مری
کس تفاخر سے یہ اعجاز ہوا چاہتا ہے

سن رہا ہوں مَیں کچھ ایسا کہ سبھی کہتے ہیں
نازش! اب تم پہ ہمیں ناز ہوا چاہتا ہے

شبیر نازش

نہیں ہو سکتا مرے یار! نہیں ہو سکتا
عشق، عاشق کا طرفدار نہیں ہو سکتا
مر رہا ہے جو مری ایک جھلک کی خاطر
اس کا کہنا تھا اسے پیار نہیں ہو سکتا
چاند سورج کو بھی آغوش میں لے لیتا ہے
اور اِس بات سے انکار نہیں ہو سکتا
تو مرا دوست ہے اور دوست بھی اچھا والا
تو مری راہ کی دیوار نہیں ہو سکتا
ہم بڑی عمر میں اے عشق! تری نذر ہوئے
کھل کے اِس عمر میں اِظہار نہیں ہو سکتا

جسم تو جسم، مری روح بھی ہے ایک ہی اِسم
اور اِس اِسم سے اِنکار نہیں ہو سکتا
جھوٹ کہتا ہے کوئی ایسا اگر کہتا ہے
وہ کسی حسن کا بیمار نہیں ہو سکتا
ایسے سردار کی سرداری نہیں مانتے ہم
جس کا سر اونچا سرِ دار نہیں ہو سکتا
عشق میں جو بھی روا رکھے دیانت نازش!
ہجر اس شخص کو آزار نہیں ہو سکتا

غزلیں

نکل نہ پاؤں ترے حلقۂ کشش سے میں
نباہ خاک کروں گا نئی روش سے میں

ادھر ادھر بھی نہ چنگاریاں اڑانے لگے
سلگتا رہتا ہوں جس آگ کی تپش سے میں

اسے نکالتا کیسے جراحتِ دل سے
جو تنگ خارِ ندامت کی ہوں خلش سے میں

بھٹکتا کیوں نہ پھروں سائے کے تعاقب میں
گریز کرتا ہوا اک وفا منش سے میں

اداس کر کے اسے اک گھڑی قرار نہیں
سپردِ رنج ہوں اپنی ہی سرزنش سے میں

اکرم جاذب

خاک صحرا کی چھانتا ہوں میں
کہہ رہے ہو ہرا بھرا ہوں میں

ہنس رہا ہوں مرونا لیکن
درد سے تلملا رہا ہوں میں

غرق بحرِ سکوت میں ہو کر
زمزمہ بن کے گونجتا ہوں میں

دیکھ اُس کے زوال کا منظر
جو سمجھتا رہا خدا ہوں میں

اس قدر مہرباں ہے تنہائی
اپنے ہمراہ چل پڑا ہوں میں

تشنگی سے نڈھال ہوں لیکن
میٹھا چشمہ بنا ہوا ہوں میں

اک بلاوا ہے ایک بہکاوا
اور تذبذب میں پڑ گیا ہوں میں

کس نفاست سے ہے تراشا گیا
تجھے حیرت سے دیکھتا ہوں میں

لگ رہا ہے کہ آج پہلی بار
زندگی سے گلے ملا ہوں میں

خواب میں یا خیال میں تجھ سے
کہیں پہلے بھی مل چکا ہوں میں

پل میں جاذبؔ اُٹھے حجاب ایسے
جیسے برسوں کا آشنا ہوں میں

غزل

کون اپنے تھے جو دشمن کے حواری نکلے
بات نکلی ہے تو پھر ساری کی ساری نکلے

ہم تو سمجھے تھے کہ تقدیسِ قلم جانتے ہیں
ہائے جو لوگ کرائے کے لکھاری نکلے

میری جانب سے یہ اعلان سناؤ سب کو
جو مری صف میں ہے گر عشق سے عاری، نکلے

یہ کوئی کھیل نہیں سوچ سمجھ کے کرنا
یہ نہ ہو عشق کہیں جان پہ بھاری نکلے

دیکھنے لگتے ہیں سب لوگ مری آنکھوں میں
میرے ہر شعر میں جب بات تمھاری نکلے

تخت پر جن کو بٹھایا تھا فسانے میں صغیرؔ
وہ اداکار تو شجرے سے بھکاری نکلے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہرِ کرم چمکایا
پگ پگ دھوپ کا ہُن برسایا

غزل

خوشی ملے بھی تو چہرہ نہیں بدلتے ہیں
کہ ہم کبھی صفِ گریہ نہیں بدلتے ہیں

مجھے یقیں ہے کہ دنیا ضرور بدلیں گے
جو اختلاف پہ لہجہ نہیں بدلتے ہیں

نہ جانے کون مصیبت میں کام آ جائے
کسی کے ساتھ رویہ نہیں بدلتے ہیں

جنہیں بہت ہے عبارت کے فن سے آگاہی
ترا لکھا ہوا جملہ نہیں بدلتے ہیں

پرانی عادتیں پہچان بن گئیں میری
سو خود کو اتنا زیادہ نہیں بدلتے ہیں

سمجھ رہے ہیں پرندے قفس کو گھر اپنا
شکاری اِس لیے پنجرہ نہیں بدلتے ہیں

خدا مجھے بھی عطا کردے ایسے دوست کہ جو
چراغ بجھنے پہ خیمہ نہیں بدلتے ہیں

تجھے پتہ نہیں، عہدِ جدید کے عشاق
جنوں بھی آئے تو حلیہ نہیں بدلتے ہیں

تو زندگی کو بدلنے کی بات کرتا ہے
ہم اُس کے ہجر میں حجرہ نہیں بدلتے ہیں

علیؑ بتول کے بچوں کو ماننے والے
ستم کے خوف سے رستہ نہیں بدلتے ہیں

ازور شیرازی

غزل

جھوٹ رعنائی سے تشہیر میں آ جاتا ہے
سچ کہا جائے تو تعزیر میں آ جاتا ہے

منصفی چاہیے انصاف عطا کرنے میں
فرق کیوں عدل کی تفسیر میں آ جاتا ہے

ہر دفعہ خواب بُنا جاتا ہے پہلے سے جُدا
مسئلہ خواب کی تعبیر میں آ جاتا ہے

خوف اعصاب پہ طاری کیا جاتا ہے بہت
خدشہ انجام کا تدبیر میں آ جاتا ہے

کیا عجب ذوقِ اسیری ہے کہ چلتے چلتے
پاؤں خود حلقۂ زنجیر میں آ جاتا ہے

میں کہاں جاؤں بھلا نقل مکانی کر کے
ہر علاقہ تری جاگیر میں آ جاتا ہے

مسکرانے کی میں کوشش تو بہت کرتا ہوں
دکھ ہی ایسا ہے کہ تصویر میں آ جاتا ہے

نقشہ کاغذ پہ کوئی اور ہی ہوتا ہے امر
شہر کچھ اور ہی تعمیر میں آ جاتا ہے

امر مہکی

غزل

لاکھ تو خود کو چھپا صاف پتا چلتا ہے
تو بھی اب تو نہ رہا صاف پتا چلتا ہے

اے مرے دل! تُو بُھلا کیوں نہیں دیتا اُس کو
تُو بھی دشمن ہے مرا، صاف پتا چلتا ہے

کتنی ویران ہیں، خالی ہیں تمہاری آنکھیں
قافلہ دل کا لُٹا صاف پتا چلتا ہے

اُس کے ہاتھوں کی لکیریں بھی ہیں دیکھی بھالی
اپنی قسمت کا لکھا صاف پتا چلتا ہے

فائدہ کچھ بھی نہیں بات کوئی کرنے کا
میں اُسے ہار چکا صاف پتا چلتا ہے

دل سے نکلی ہے دعا، آنکھ سے آنسو ٹپکے
جو مرا حال ہُوا صاف پتا چلتا ہے

ہاں تجھے پیار ہے ہر بات میں یہ ذکر نہ کر
تُو بتا یا نہ بتا صاف پتا چلتا ہے

وسیم جبران

غزلیں

تو نے لوٹا ہے ہمیں ایک اشارہ کر کے
اب کہاں جائے گا تو ہم سے کنارہ کر کے

چاند روشن تھا ترے رخ کی طرح سے کل شب
میں نے پوجا جسے قسمت کا ستارہ کر کے

جلوۂ حسن کوئی دیکھ کے مر جاتا ہے
اور زندہ ہوں میں اب تک بھی نظارہ کر کے

ساتھ ایسا ہے یہ اپنا کہ زمانے والے
اب پکاریں گے ہمیں چاند ستارہ کر کے

اے مرے خواب! تجھے پا ہی لیا ہے آخر
اپنی اک عمر کا ناصر نے خسارہ کر کے

عامر عباس ناصر اعوان

ان کو کوئی بھی غم نہیں ہوتا
جن کی آنکھوں میں نم نہیں ہوتا

جس کا پہلو پڑاؤ بھنوروں کا
اس کا کوئی صنم نہیں ہوتا

کیا کرے گا مقابلہ خود کا
جس کے سینے میں دم نہیں ہوتا

جانے اس وقت کون ہوتا ہے
جب کوئی ہمقدم نہیں ہوتا

جس کے من میں نہ ہو وفا کا ضمیر
اس کا کوئی الم نہیں ہوتا

جس کی آنکھیں حیا سے خالی ہوں
وہ محبت میں ضم نہیں ہوتا

گر مجھے تم سے عشق نہیں ناصر!
ربط پھر یوں بہم نہیں ہوتا

غزل

نہیں ملی مجھے منزل ابھی میں راہ میں ہوں
وہ روشنی میں ہے اور میں شبِ سیاہ میں ہوں

سفر کے نام پہ تو نے تھکا دیا ہے مجھے
نہ جانے قید ہوں میں یا تری پناہ میں ہوں

دیا فریب کسی کو مرے وسیلے سے
خبر نہ تھی کہ میں شامل ترے گناہ میں ہوں

میں بھول بیٹھی تری دسترس کے سب لمحے
کہ اب تو میں بھی کسی اور کی نگاہ میں ہوں

تری طرح تھے کئی میرے چاہنے والے
کسی کے دل میں بسی تھی کسی کی آہ میں ہوں

مجھے تلاش نہ کر نفرتوں کی دنیا میں
حیات میں تو محبت کی بارگاہ میں ہوں

شفقت حیات شفق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

ضبط کا پیکر ہوں ، جذباتی نہیں ہوں
عام سی عورت ہوں ، شہزادی نہیں ہوں

آپ کیوں مجھ کو منانے پر بضد ہیں؟
رُوٹھ جانے کی تو میں عادی نہیں ہوں

سنگ دل لوگوں کا آئینہ نہیں ہوں
بند تالوں کی کوئی چابی نہیں ہوں

ایک دن اس نے کہا، "جاؤ، تمہارے
باغِ دل کا آج سے مالی نہیں ہوں "

پاس آئیں، آپ کو معلوم ہو، مَیں
خارزاروں میں گھِری وادی نہیں ہوں

اشک پی لوں اور آہیں دفن کردوں
اس قدر تو میں بھی فولادی نہیں ہوں

میں بھلا تکمیل کے زینے چڑھوں کیوں؟
میں مکمل ہوں جیا ، آدھی نہیں ہوں

جیا قریشی

غزلیں

کل اچانک مل گیا تھا دِل دُکھانے کے لیے
دے گیا پھر اِک نشانی یاد آنے کے لیے

راحتیں سب لے گیا ہے اِس دلِ مغموم کی
پھر بنایا ہے مجھے عبرت زمانے کے لیے

اب ذرا دم لے خُدا کے واسطے برقِ تپاں
چُن رہا ہُوں تِنکا تِنکا آشیانے کے لیے

اب یہی باقی رہا ہے یاد آنے کے لیے
مُجھ سے وہ ملتے ہیں لیکن دِل دُکھانے کے لیے

دیکھ، اگر ہے دوست، تو آ کر مری آشفتگی
ایک میں ہی رہ گیا ہُوں دِل لگانے کے لیے

پھر کسی چلمن سے اُبھرا ہے کوئی عکسِ جمیل
دِل کے ویرانوں میں قائل مسکرانے کے لیے

عمر قیاز قائل

میں جب سے حرفِ صداقت کا ترجمان ہُوا
پلک جھپکتے مخالف مرا جہان ہُوا

سنبھل سکی نہ کبھی حالتِ بُریدہ بدن
وفا کے شہر میں کچھ ایسا امتحان ہُوا

دِکھا کے مُجھ کو شبِ غم میں ٹمٹماتے چراغ
عجیب آدمی تھا وقت کی اُڑان ہُوا

یہ سچ ہے ایسی نہیں حالتِ دَروں بھی مری
یہ سب کمالِ تخیل ہے جو بیان ہُوا

مرے لیے یہ زمیں بھی ہے آسماں کی طرح
کہ جس کے سائے میں پل پل کے میں جوان ہُوا

میں اُس مقامِ محبت پہ ہُوں جہاں قائل
ترا خیالِ محبت بھی اِک گمان ہُوا

غزل

نظر سے ایسا گراتے ہیں بھول جاتے ہیں
جفا کے زخم لگاتے ہیں بھول جاتے ہیں

بڑا عجیب وتیرہ ہے شہر والوں کا
غرض کے رشتے نبھاتے ہیں بھول جاتے ہیں

کوئی تو ہے جو مرا ہاتھ تھام لیتا ہے
گرانے والے گراتے ہیں، بھول جاتے ہیں

جفا کے دور میں خود دار دونوں ہاتھوں سے
انا پہ جان لٹاتے ہیں بھول جاتے ہیں

خروج کرتے ہوئے قافلوں میں دیکھا ہے
وجود، خاک اڑاتے ہیں بھول جاتے ہیں

کسی کی ذات پہ کیچڑ اچھالنے والے
خود اپنی ذات بتاتے ہیں، بھول جاتے ہیں

بوقتِ فرقتِ یاراں یہ بارہا دیکھا
بس ایک ہات ہلاتے ہیں بھول جاتے ہیں

نبھاؤ دوستی ساجد مگر خیال رہے
یہ لوگ وقت بتاتے ہیں بھول جاتے ہیں

سجاد حسین ساجد

غزل

وصال و ہجر کے دورانیے پڑے ہوئے ہیں
کہیں پہ خواب کہیں رتجگے پڑے ہوئے ہیں

تمہارے لمس سے لذت کا رس نچوڑا ہے
بدن میں اب بھی کئی ذائقے پڑے ہوئے ہیں

ہمیں سفر کا اشارا نہیں ہوا ورنہ
زمیں پہ راستے ہی راستے پڑے ہوئے ہیں

کسی کا عکس کسی سے بدل نہ جائے کہیں
اک آئینے میں کئی آئینے پڑے ہوئے ہیں

بدل رہے ہیں شب و روز جس روانی سے
کچھ حادثات یہیں سامنے پڑے ہوئے ہیں

پڑے ہوئے ہیں کئی وسوسے مرے دل میں
کئی گِلے ہیں جو میرے گلے پڑے ہوئے ہیں

عاصم اعجاز

غزل

یہ اذنِ جست فقط اک بہانہ ہوتا ہے
کہاں ٹھہرتے ہیں وہ جن کو جانا ہوتا ہے

ہمارے سر پہ محبت کا اتنا بوجھ نہ ڈال
ہمیں معاش کا دُکھ بھی اُٹھانا ہوتا ہے

جہاں پہ سوختہ جذبات رکھے جاتے ہیں
ہر ایک دل میں کہیں سرد خانہ ہوتا ہے

ہمارے تذکرے صدیوں لبوں پہ رہتے ہیں
ہمارے دن نہیں ہوتے زمانہ ہوتا ہے

کُھلے کواڑ علامت ہیں آس کی لیکن
ہوا کے رخ پہ دیا بھی جلانا ہوتا ہے

ہمارے حال پہ جیسی گزر رہی ہو حسن
ہمیں رویہ بھی ویسا بنانا ہوتا ہے

عطاالحسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی مجھے سنوار رہا ہے تراش کر
پتھر کے پاس تیشہ بکف کون آ گیا

غزل

وہ جو ملتا ہے گماں کی حد تک
ہم نے چاہا تھا مکاں کی حد تک

تجھ پہ مر جانا امر ہونا تھا
وقت کی قید تھی جاں کی حد تک

زخم بھر جانے کا امکاں کم ہے
تیر پھینکا ہے کماں کی حد تک

ان کہی بات عیاں تھی ، لیکن
وہ سمجھتا ہے بیاں کی حد تک

درد دریا تھا ہنسی کے پیچھے
آنکھ نے دیکھا زماں کی حد تک

خواب سے جاگے تو ہم نے جانا
ہر تعلق تھا گماں کی حد تک

بشیر احمد حبیب

غزل

نامور وہ ہوگئی ہے ناموں کے ساتھ ساتھ
رقص کرتی ہے انگوٹھی انگلیوں کے ساتھ ساتھ

اس کبوتر کے نشیمن میں ہے شاید ایک سانپ
قہقہے جو آ رہے ہیں سسکیوں کے ساتھ ساتھ

ہو نہ پایا ہے کبھی ان دونوں جسموں کا ملاپ
ایک صحرا چل رہا ہے پانیوں کے ساتھ ساتھ

عہدیداروں میں بٹتی ہے تغیر کی کتھا
ظرف بھی تبدیل ہوگا کرسیوں کے ساتھ ساتھ

آخرش اس زندگانی کا ہوا ہے اختتام
مشکلیں چلتی رہیں آسانیوں کے ساتھ ساتھ

تجھ کو سب کچھ دے دیا ہے قلزمِ زخّار نے
سیپ جو محوِ سفر تھے موتیوں کے ساتھ ساتھ

رایگانی کی وساطت سے زمیں پر گر گیا
خوش مزاجی کا تصور پانیوں کے ساتھ ساتھ

رنگتوں کا رنگ اترا دیکھ کر احسن عزیز
پھول بھی اڑنے لگے تھے تتلیوں کے ساتھ ساتھ

احسن عزیز

غزل

دل میں ہر سُو تری مُورت کو سجا رکھا ہے
اِس نے طوفان اِسی پر تو اُٹھا رکھا ہے

جن فرشتوں سے مجھے سجدہ کرایا تُو نے
اُن فرشتوں کو ہی کاندھوں پہ بٹھا رکھا ہے

روز وعدے بھی کرو اور بُھلا دو اِن کو
ظلم کیسا یہ مِری جان روا رکھا ہے

دل کی حالت کا یہ غمّاز ہے لڑکی! تو نے
کونہ چُنری کا جو دانتوں میں دبا رکھا ہے

یوں تو سارے ہی حسیں لگتے ہیں یکساں ظالم
ظلم کا سب نے مگر طور جدا رکھا ہے

ہر کسی کو ہی بنا لیتی ہے اپنا جانی
اُس کی اِس چال نے دنیا کو گُھما رکھا ہے

بھوک سے بڑھ کے نہیں کوئی مصیبت ہمدم
اِس نے فُرقت کا تری غم بھی بُھلا رکھا ہے

اک ذرا سوچو کہ کتنا ہے ضیؔا وہ عاقل
جس نے ہم سب کو اِشاروں پہ نچا رکھا ہے

سید ضیا حسین

غزل

خواہشوں کا تقاضا بدل جائے گا
ایک دن یہ زمانہ بدل جائے گا

سیرتِ مصطفیٰؐ پہ ذرا چل کے دیکھ
زندگی کا طریقہ بدل جائے گا

ہوں وفاؤں سے اُس کی شناسا بہت
وہ تو کر کے بھی وعدہ بدل جائے گا

اہلِ دانش کی صحبت کرو اختیار
گفتگو کا سلیقہ بدل جائے گا

دو قدم ساتھ میرے چلو گے اگر
واپسی کا ارادہ بدل جائے گا

صدام ساگر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بت کو دیکھا تو بت ہوا خالد
جی میں تھا ، دیکھ کر گزر جاؤں

غزل

سپاسِ بندگاں ابھی
ادا کرو میاں ابھی

گرا ہی چاہتا ہے کیا
سروں پہ آسماں ابھی

گزر گیا میں آپ سے
رہا میں اب کہاں ابھی

ترس نہ مجھ پہ کھایئے
خلوصِ دوستاں! ابھی

یہ اختیارِ جبر ہے
کھڑا ہوں میں جہاں ابھی

جبینِ عجز پہ مرا
ہے داغ کانشاں ابھی

پڑا رہے یہ نور سا
حجاب درمیاں ابھی

نہ ڈال اس پہ بارِ عشق
یہ دل ہے ناتواں ابھی

جھنجھوڑتا ہوں وقت کو
وہ بوڑھا میں جواں ابھی

میں سُن رہا ہوں اَن سُنی
سُنی سی داستاں ابھی

اُڑی ہیں اُن لبوں سے دو
وہ شوخ تتلیاں ابھی

چُرا نہ آنکھ، ساقیا!
بھرا ہے دل کہاں ابھی

گزر گئی ہے جان سے
براتِ عاشقاں ابھی

ہے عارضِ جمال پر
نگاہِ دوستاں ابھی

سرفراز عارض

غزل

وہ جو چند حال تباہ تھے، وہ کہاں گئے
مرے قتل کے وہ گواہ تھے، وہ کہاں گئے

مری ایک نیکی کے بدلے اتنی نوازشیں
وہ جو میرے اتنے گناہ تھے، وہ کہاں گئے

وہ میں جن سے لڑتا تھا جنگ غم کے محاذ پر
وہ جو اشک میری سپاہ تھے، وہ کہاں گئے

کوئی دور تک بھی نظر نہیں مجھے آرہا
وہ جو تیرے گردونواح تھے، وہ کہاں گئے

انہیں تیرگی نے نگل لیا ، یا اگل دیا
وہ جو لوگ بخت سیاہ تھے، وہ کہاں گئے

جنہیں اپنے پہلو میں تو بٹھاتا تھا رات دن
وہ جو تیرے نور نگاہ تھے، وہ کہاں گئے

تاثیر جعفری

غزل

تجھ سے بھی خوش زَبان سے، کچھ بولتے نہیں
وہ جو بھرے جہان سے کچھ بولتے نہیں

حیراں ہوں شہر بھر کے حسینوں کو کیا ہوا
رہتے ہیں بدگمان سے ، کچھ بولتے نہیں

وہ ماہِ نیم ماہ نظر سے جو محو ہے
تارے بھی آسمان سے کچھ بولتے نہیں

ہم بولنے کو بولتے ہیں بزم میں مگر
پہلی سی آن بان سے کچھ بولتے نہیں

کل تک تمہارا شہر میں تھا رعب و دبدبہ
رہتے ہو اب بھی شان سے، کچھ بولتے نہیں

تصویر بن کے ساتھ تھا میں اس لیے کہ وہ
پوچھے پکڑ کے کان سے ، کچھ بولتے نہیں

امتیاز انجم

غزل

فسانہ غم کا رسوائے جہاں ہوتا تو کیا ہوتا
محبت میں ہر اک آنسو زباں ہوتا تو کیا ہوتا

مرے ہونٹوں پہ اک موجِ تبسم دیکھنے والے
تجھے اندازۂ آہ و فغاں ہوتا تو کیا ہوتا

دعائیں دے رہی ہیں باغ کی بربادیاں جس کو
وہ قسمت سے ہمارا باغباں ہوتا تو کیا ہوتا

مجھے بے پر بھی اُڑنا آ گیا ہے اے زمیں اب تو
اگر کوئی مرا بھی آسماں ہوتا تو کیا ہوتا

خموشی جس کی پھیلی شہر میں اک داستاں بن کر
وہ محسن بھی اگر جادو بیاں ہوتا تو کیا ہوتا

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھوں پہ ہیں پلکوں کی نقابیں خالد
کون دیکھے کہ سرِ راہ گزر کون آیا

غزل

ہر اک سے پیار مگر ہم پہ وار کرتے ہوئے
یہ کون لوگ ہیں دل تار تار کرتے ہوئے

مثالِ قیس اذیت کا لطف لیتا ہوں
جنونِ عشق میں اپنا شکار کرتے ہوئے

شجر کی مثل کھڑے ہیں ہزار صدیوں سے
ہم ایک دوسرے کا انتظار کرتے ہوئے

کبھی کبھار تو ہم لوگ مرنے لگتے ہیں
ہم اپنے آپ کو زندہ شمار کرتے ہوئے

خیالِ یار ہو رختِ سفر ضروری نہیں
کھلا یہ راز سفر اختیار کرتے ہوئے

گزر گیا ہے جدائی کا دکھ بھرا لمحہ
مرے وجود کو سارب غبار کرتے ہوئے

مزمل رضا سارب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

باندھا گیا ہے جسم کے پتھر سے کیوں مجھے
نفرت ہے آپ اپنے ہی پیکر سے کیوں مجھے

غزل

ایک دو جے کی نظر میں تاکتے رہ جائیں گے
اور دیواروں پہ لٹکے آئنے رہ جائیں گے

ہم پسِ دیوار ہو جائیں گے جب چلتے ہوئے
وہ سرِ دیوار ہم کو ٹانکتے رہ جائیں گے

چیختے رہتے ہیں کوئی کان تک دھرتا نہیں
ہم جو چپ ہو جائیں سارے چیختے رہ جائیں گئے

لفظ مر جائیں گے سارے ذہن میں رکھے ہوئے
خالی کاغذ پر فقط کچھ حاشیے رہ جائیں گے

ٹھنڈی ہو جائیگی چائے میز پر رکھی ہوئی
اور ہم اک دوسرے کو دیکھتے رہ جائیں گے

ایک دن بولیں گے میرے شہر کے گونگے سبھی
ایسا بولیں گے کہ اندھے دیکھتے رہ جائیں گے

اشک رہ جائیں گے دو آنکھوں کی پلکوں پر علی
اور سماعت میں ہمارے قہقہے رہ جائیں گے

علی رضا بلوچ

غزل

جو مسندِ دل پر ہو نشیں ڈھونڈ رہے ہیں
دنیا میں کوئی ایسا حسیں ڈھونڈ رہے ہیں

ان گھور اندھیروں میں جو ہو چاندسی روشن
ہم لوگ ازل سے وہ جبیں ڈھونڈ رہے ہیں

بے مول سی یادوں کے خزانے لیے دل میں
مسمار مکانوں کو مکیں ڈھونڈ رہے ہیں

اس عشق کے آزار نے چھوڑا نہ کہیں کا
سایہ ہے کہیں اور کہیں ڈھونڈ رہے ہیں

مصروف رہے ہیں جو سدا سنگ زنی میں
وہ لوگ محبت کی زمیں ڈھونڈ رہے ہیں

وہ شخص کسی اور ہی دنیا کا مکیں ہے
جس شخص کو ہم دل کے قریں ڈھونڈ رہے ہیں

مولا ترے بندوں کا یقیں تجھ پہ ہے قائم
وحشت میں بھی جو عرشِ بریں ڈھونڈ رہے ہیں

عالمگیر ہراج

غزل

حسابِ زیست میں سب سے بڑی مصیبت ہے
کسی کا ہجر فقط عارضی مصیبت ہے

اٹھائے پھرتی ہے یوں تو ہزار بوجھ مگر
زمیں کی پشت پہ آلودگی مصیبت ہے

کہ ہو چکے ہیں سبھی روشنی سے یوں مایوس
ہمارے شہر میں اب روشنی مصیبت ہے

دیارِ ہجر سے ہر شخص کہہ رہا ہے یہی
دیارِ ہجر میں آسودگی مصیبت ہے

ہزار چہروں میں بھی منفرد نظر آئے
ہزار چہروں میں اک سانولی مصیبت ہے

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دوستوں کی بھیڑ میں خالد کہاں یاد آئے گا
ذہن سے تیرے بھی اک دن محو ہو جاؤں گا میں

غزلیں

تھوڑا سا آج ہنس کے دکھا اور کچھ نہیں
یعنی مجھے ہے جینا ذرا اور کچھ نہیں

پل پل جو راحتوں کو ترستے ہیں لوگ یاں
یہ زندگی ہے اُن کو سزا اور کچھ نہیں

خواہش ہے میرے دل میں بسے رہنے کی سدا
اپنی اَنا کو دل سے مٹا اور کچھ نہیں

باقی نہیں جو تیری مسیحائی میں اثر
پھر زہر ہی ہے میری دوا اور کچھ نہیں

کرتا ہے تو جو میری وفا پر بھی اعتراض
دل میں بھری ہے تیرے جفا اور کچھ نہیں

کچھ دیر کے لیے مرے پہلو میں بیٹھ جا
کرنا ہے تیرا قرض ادا اور کچھ نہیں

جن کے مکان کچے ہوں اُن کے لئے شہاب
بارش عذابِ جاں کے سوا اور کچھ نہیں

شہاب اللہ شہاب

میری سبھی دعاؤں کا ضائع اثر گیا
وعدوں سے اپنے آج ستم گر مکر گیا

محروم کھیل سے رہا بچہ غریب کا
بچپن کھلونے بیچتے سارا گزر گیا

آنکھوں میں جھانکنے کی اجازت جو دی اُسے
آہستگی سے دل میں وہ میرے اتر گیا

میں مصلحت کے ہاتھوں سے مجبور ہوں مگر
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اُس سے ڈر گیا

شیطان کر سکا نہ یہاں جس طرح کے کام
انسان وہ بھی سارے برے کام کر گیا

جو دنیا بھر کے قتل کا منصوبہ ساز تھا
وہ شخص آج اپنے ہی ہاتھوں سے مر گیا

چاروں طرف بھنور تھے بہت موجزن شہاب
اُترا جو میں تو سارا سمندر اُتر گیا

غزل

ستم تو یہ ہے کہ خود سے بھی گفتگو نہ رہی
تمہارے بعد اجالوں کی آرزو نہ رہی

زمین زاد زمیں کو نکھار سکتے تھے
یہ اور بات کسی کو بھی جستجو نہ رہی

وہ جس کو دیکھ کے جیتے تھے اس جہان میں ہم
یہ کیا ہوا کہ وہ تصویر روبرو نہ رہی

تمھارے پیار کو جانا کچھ ایسے فرض میاں
کبھی بھی خشک مرے دل کی آب جو نہ رہی

متاع قلب لٹا کر بھی یہ نہیں سوچا
ہماری آنکھ کبھی یوں لہو لہو نہ رہی

وفا کے گیت جو اس کی زباں سے چھینے گئے
سمن خموش ہوئی یوں کہ خوش گلو نہ رہی

رخسانہ سمن

غزل

چل رہا ہوں مگر اداسی ہے
اے مرے ہم سفر! اداسی ہے

کھڑکیوں پر ہیں نوحے لکھے ہوئے
اور دیوار و در اداسی ہے

اک نحوست ہے ساتھ اپنے سدا
ہم جدھر ہیں ، اُدھر اداسی ہے

آگہی ایک مستقل دکھ ہے
اور اس کا ثمر اداسی ہے

کل ہی تو اس کا حل نکالا تھا
آج بار دگر اداسی ہے

اتنے بے سمت تو نہیں تھے ہم
بس یہی سوچ کر اداسی ہے

کیسے کیسے جوان لے ڈوبی
کتنی شوریدہ سر اداسی ہے

لوٹ لے کوئی راہ زن مجھ کو
میرا رختِ سفر اداسی ہے

میرا لکھا نہ رایگاں ٹھہرے
زیرِ دکھ ہے ، زبر اداسی ہے

خال و خد بے سبب نہیں بگڑے
اے مرے بے خبر! اداسی ہے

میں حقیقت پسند ہوں ، لیکن
کوئی راہِ مفر ' اداسی! ہے

مجھ سے معصوم کو نہیں بخشا
کس قدر کم نظر اداسی ہے

تیرا شاعر نہیں رہا تو پھر
دیکھ لے در بہ در اداسی ہے

اس قدر بھی نہ کوسنا احمد
میرا شعری ہنر اداسی ہے

احمد محسود

غزل

اس طرح اپنے ہمارے جب دعا دینے لگے
راہ کے پتھر بھی ہم کو راستہ دینے لگے

رات کی تاریکیاں کرنے لگیں ہم سے حسد
پھر اجالے داغِ دل کے مشورہ دینے لگے

ہو گئی ان کی حقیقت رفتہ رفتہ بے نقاب
بے وفا عہدِ وفا کر کے دغا دینے لگے

دل دکھانے کے لئے ہم دل لگی کے شہر میں
بے وفاؤں کو محبت کا صلہ دینے لگے

کشتیوں کو تیز لہروں سے گزرتے دیکھ کر
خود بھنور ان کشتیوں کو راستہ دینے لگے

ڈھل گیا سورج تو دیکھا شب اندھیری ہو گئی
پھر ستارے رات میں سب کو ضیا دینے لگے

ثانیہ دشواریوں سے میں نے کی جب دوستی
راستے آسانیوں کے خود پتہ دینے لگے

ثانیہ جمال ثانیہ

غزلیں

یہ تری چاہتوں کا موسم ہے
ہر طرف حیرتوں کا موسم ہے

میں ترے ہجر میں اکیلی ہوں
یہ مری وحشتوں کا موسم ہے

آدمی ، آدمی کو ہے کاٹے
ہر طرف نفرتوں کا موسم ہے

سب پرندوں نے اب ہے کوچ کیا
آج کل ہجرتوں کا موسم ہے

کوئی امید اب نہیں باقی
گل! تری حسرتوں کا موسم ہے

کوکی گل

میں جستجو کی مسافر تھی ،ہمسفر نہ ملا
پھری میں دشت میں تنہا، کوئی بھی گھر نہ ملا

وجودِ خاک میں یکجا کروں گی پھر خود کو
شعورِ ذات مجھے اس جنم میں گر نہ ملا

قدم قدم پہ مجھے حاسدین آن ملے
مجھے جو میرا پتہ دے وہ نامہ بر نہ ملا

سمندروں کی بھی چھانی تھی خاک میں نے کبھی
کہیں نہ پیاس بجھی اور کہیں گہر نہ ملا

کھلی کتاب کی صورت رہی ارم یوں ہی
کہ دل میں راز چھپانے کا بھی ہنر نہ ملا

رافعہ ارم مرزا

غزل

یار! اِس ایک بات پر بحث کا اختتام ہے
سانس بھی ہے تری غلام، دل بھی ترا غلام ہے

طاق میں لو لرز گئی میری نظر سمجھ گئی
آج کی شب ہوا کے ساتھ روشنی ہمکلام ہے

یہ بھی عجیب بات ہے ایسے ہنروروں کے بیچ
ایک ہی فن ہے اپنے پاس اور برائے نام ہے

سر بھی رکھا سرِ سناں، خیمے بھی ہو گئے دھواں
ریت بھی لال ہو گئی، کیسی فسردہ شام ہے

خونِ جگر جلاتے ہیں درد غزل میں لاتے ہیں
مجھ سے سخنوروں کا بس ایک یہی تو کام ہے

ایک ہی التجا ہے دوست! ایک ہی مشورہ ہے دوست!
وقت کے پیچھے مت چلو، دیکھو! یہ تیز گام ہے

دیکھیں! مرا تباہ دل، لب پہ رکھی ہے جس کے سِل
دیکھیں! اسے مری طرح، آپ کا احترام ہے

علی آرش

غزل

رشتہ ہر ایک توڑ دیا ہے خوشی کے ساتھ
"الفت سی ہوگئی ہے غمِ زندگی کے ساتھ"

کہتے تھے جی نہ پائیں گے تیرے بغیر ہم
پر جی رہے ہیں آج بھی تیری کمی کے ساتھ

ایسا بھی کیا قصور کوئی ہم سے ہو گیا
ملتا تو ہے وہ ہم سے مگر بے رخی کے ساتھ

الزام جس قدر بھی تھے ناحق وہ دھر دیے
برسوں زمانہ کھیلا مری سادگی کے ساتھ

پردے میں دوستی کے ملے ہیں فریب پر
ملتے رہے خلوص سے پھر بھی سبھی کے ساتھ

سنتا ہے وہ سبھی کی جو دل سے پکاریے
سر کو جھکا کے دیکھ کبھی عاجزی کے ساتھ

مدت سے جن کو رکھا تھا روبی سنبھال کے
آنسو چھلک پڑے وہ اچانک ہنسی کے ساتھ

روبینہ ممتاز روبی

غزلیں

کس طرح پہچان پائے آئنہ خانہ مجھے
جھریوں سے بھر گیا ہے آپ کا جانا مجھے

آ گیا ہوں میں ادھر تو مجھ کو بے نشہ نہ رکھ
تیری آنکھیں دیکھ کر بھولا ہے مے خانہ مجھے

میں نے صحراؤں کی اب تک خاک چھانی ہی کہاں
کہہ رہے ہیں کس لئے سب لوگ دیوانہ مجھے

راستے کی دھول نے بدلا مرا حلیہ مگر
میری آنکھوں کی چمک سے اس نے پہچانا مجھے

ایک دو پیرے بدلنے سے نہیں پڑتا ہے فرق
پھر سے لکھنا ہے بدل کر پورا افسانہ مجھے

عدنان خالد

رستہ دشوار تھا پھر بھی مجھے آسانی تھی
میرے ہمراہ مری بے سروسامانی تھی

زندگی سے مری بیگانہ روی کا باعث
ایک صورت تھی خیالوں میں جو انجانی تھی

باغ میں ایک پرندہ مری جانب آیا
اس نے آواز مری دور سے پہچانی تھی

وہ نہ سہہ پاتا اچانک سے بدل جانا مرا
میں نے قسطوں میں جدائی اسے سمجھائی تھی

یاد عدنان بہت آتا ہے بچپن اپنا
وہ بھی کیا دن تھے کہ ہر وقت کی سلطانی تھی

غزل

طائرِ لاہوت ہو کر پھر بھی زیرِ دام ہیں
اپنی طاقت ہیں ہم اور لرزہ براندام ہیں

منظرِ آشام کیا ہو پھیلتا ہر سُو سراب
حاصلِ گفتارِ یاراں زیرِ لب دشنام ہیں

جتنی ہیں خاموش آنکھیں، اتنا ہی محشر بپا
زہر پیتے ہونٹ سارے برسرِ الزام ہیں

بادہ کش ہیں اور لیے عذرِ گنہ بھی چار روز
ساقیا تُو نے لنڈھائے خود بھی کتنے جام ہیں!!!

پھر شعورِ ذات کے ہر طاقچے میں دھر دیے
جتنے استفہام ہیں اور جتنے بھی ابہام ہیں

فکرِ انساں کی بلندی کا ہے سرچشمہ وہی
ارتقائے آدمیت پر کھلے الہام ہیں

معبدِ دل خوش گماں میں ایستادہ بے خودی
حائلِ راہِ خدائے لم یزل اصنام ہیں

عاجزی، فرعونیت میں بس ذرا سا فرق ہے
زیبِ تن احرام ہیں یا گردنیں اہرام ہیں

خاکِ طیبہ کو میسّر جاودانی بس، علیمؔ
چاند، سورج سب ستارے ذرہِ بے نام ہیں

علیم اطہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزل

پھول برساتے ہوئے لہجے بھی جیسے سنگ ہیں
دل ہوئے ہیں تنگ تو پھر گھر بھی کتنے تنگ ہیں

رفتہ رفتہ ڈھل گئے ہم بھی اُسی کے رنگ میں
رنگ جو اسکے تھے اپنے بھی تو اب وہ رنگ ہیں

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی کچھ بدگمانی اس قدر
ساتھ ہیں ہر لمحہ لیکن دل نہایت تنگ ہیں

چھین لی ہے فیصلہ کرنے کی طاقت وقت نے
حوصلے بے جان سے ہیں ولولے بے رنگ ہیں

تم کو پانے کی کشش میں کر لیا اتنا سفر
ذہن شل سا ہو گیا ہے پاؤں گویا سنگ ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزلیں

اس نئے دور میں وبا دل ہے
مجھ کو درپیش نت نیا دل ہے

ایک تصویر ہے مرے دل میں
ایک تصویر میں مرا دل ہے

روبرو ہے وہ خوبرو لڑکی
جیب میں ایک صاف سا دل ہے

دھڑکنوں کا ردھم سنیں تو سہی
یہ جو میرا ہے آپ کا دل ہے

سب کے حصے میں پیار آتا ہے
ماں کے جیسا بھی کوئی عادل ہے

میری تنہائیوں میں، مَیں ہوں رمیض
یا مرا درد آشنا دل ہے

رمیض نقوی

ہماری سمت تمھارا جو دھیان تک نہیں ہے
کسی کا صحرا کی جانب گمان تک نہیں ہے

میں کیا بتاؤں گا لوگوں کو تیرے بارے میں
مری رسائی تو تیرے مکان تک نہیں ہے

وہ کہہ رہے ہیں کہ پاؤں میں ہے زمیں موجود
یہاں تو سر پہ مرے آسمان تک نہیں ہے

ہمیں ملا ہے ترا لمس کچھ گھڑی کے لیے
مگر یہ دکھ ہے کہ یہ جاودان تک نہیں ہے

نشانیوں میں جو تصویر تھی جلا دی گئی
ہمارے پاس اب اس کا نشان تک نہیں ہے

مزمل ادریس

غزلیں

شہر کی بے چراغی مٹانی پڑی
آگ اپنے ہی گھر کو لگانی پڑی

صرف تم کو منانے کی خاطر مجھے
پھول سے ایک تتلی اُڑانی پڑی

رات بھر چاند دیکھا سرِ آسماں
پھر بھی تصویر تیری بنانی پڑی

تیری دنیا سے باہر نکلنے کے بعد
اک نئی دنیا مجھ کو بنانی پڑی

مدتوں بعد جب گھر سے نکلا تھا میں
شام ناراض تھی، سو منانی پڑی

مہر علی

میں نے سوچا گمان سے آگے
کچھ تو ہے لامکان سے آگے

شوق میں آسمان چھونے کے
نکلا میں آسمان سے آگے

بس خلا ہے خلا سے آگے اور
امتحاں، امتحان سے آگے

میں نے پائی یقین کی منزل
جب میں پہنچا گمان سے آگے

کسے معلوم کون سا ہو موڑ
موت کی داستان سے آگے

غزل

حادثاتی طور پر پنجرے کُھلے
تب پرندوں پر کہیں نقشے کُھلے

دستکیں دن بھر کوئی دیتا رہا
حادثے کے بعد دروازے کُھلے

اک بھکاری بھوک سے جب مر گیا
پھر کہیں مہمانوں پر کھانے کُھلے

جو محبت سے ڈراتے ہیں تمہیں
ذہن اِن کے تنگ ہیں کمرے کُھلے

"عکس مجھ پر آئنہ اُس پر گیا"
اُس کے جانے سے کئی پردے کُھلے

دوست میں پیدائشی شاعر نہ تھا
پھر تمہارے ہجر کے کھاتے کُھلے

ایک پتھر سے تعلق تھا مرا
جس سے ٹکرا کر سبھی پُرزے کُھلے

میں نے مڑ کر دیکھا، میں تھا ہی نہیں
جب محبت میں نئے رستے کُھلے

وقت جیسے ہی بُرا ہونے لگا
آستینوں سے کئی اپنے کُھلے

حسنین آفتاب

غزل

مہنگائی ہم پہ آ پڑی آفات کی طرح
تاریکی اور بڑھ گئی ہے رات کی طرح

ملنے وہ آیا اس کا یہ احسان کم نہیں
اک زخم دے گیا ہمیں سوغات کی طرح

دن کو ہنسے تو رات ہمیں غم نے آ لیا
خوشیاں اگر ملیں تو وہ خیرات کی طرح

لب پر ہنسی سجا کے بظاہر ہیں خوش مگر
آنسو رواں ہیں آنکھ سے برسات کی طرح

سب سے چھپا کے رکھ لیا دل کی کتاب میں
خلوت میں تجھ کو پڑھ لیا آیات کی طرح

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزلیں

جب کبھی میری ضرورت ہو، وہاں بولتا ہے
ورنہ وہ شخص مرے ساتھ کہاں بولتا ہے

ایک میں جس کا طرف دار کوئی ہے ہی نہیں
اور اِک تُو کہ ترے حق میں جہاں بولتا ہے

کون اس رَمز کو سمجھے کہ ترے لہجے میں
جلتی بجھتی ہوئی سگریٹ کا دھواں بولتا ہے

میں فقط تیری توجہ کا ہوں طالب ورنہ
مجھ سے ہر شخص محبت کی زباں بولتا ہے

تو بھلے دُور سہی مجھ سے، مرے گاؤں سے
دل مرا پھر بھی تجھے راحتِ جاں بولتا ہے

ارسلان ساحل

ڈھونڈ لیتا تھا مجھے کوئی چھپانے والا
اب کہاں ہے مجھے آواز لگانے والا

دل تو کرتا ہے کہ آکاش پہ جا کر دیکھوں
گھومتا ہوگا زمیں کو بھی گھمانے والا

مدتوں بعد مجھے چومنے والے انساں
تو ہی ہے دشت میں اک پھول کھلانے والا

کوئی انسان ترا نقش نہیں بُن سکتا
بس خدا ہے تری تصویر بنانے والا

میری الجھن کا سبب صرف یہی ایک سوال
کیوں مجھے یاد ہے ہر شخص بھلانے والا

سید صائم شیرازی

غزلیں

تجھ کو سوچ کے سونے والے جب جب بھی بیدار ہوئے
پہلے اک رُوداد پہ روئے پھر چہرے گلزار ہوئے

اول شب تو نیند کو میں نے طعنوں سے ہی مار دیا
شب کے آخری حصے مجھ پر خوابوں کے سو وار ہوئے

ہنستے ہنستے آپس میں ہم اک دن اتنے تلخ ہوئے
پہلے آنکھ کے تیور بدلے پھر لہجے تلوار ہوئے

گھر میں جتنے پیڑ لگے تھے اک بھی سایہ دار نہ تھا
پھر اک روز پرندے اترے اور سب سایہ دار ہوئے

کتنا اچھا بیت رہا تھا جیون جینے والوں کا
جانے کس نے کان بھرے وہ جینے سے بیزار ہوئے

اسد رضا سحر

محبتوں میں عنایتیں بھی ملا رہا ہوں
میں چاند ہوں اور اس کو تارا بنا رہا ہوں

مجھے کیا اس نے رد ہمیشہ ہر اک جگہ پر
اور آج اس کو میں پھر سے واپس بلا رہا ہوں

یہ مجھ پہ صحرا کی صحبتوں کا اثر ہے شاید
بغیر پوچھے میں سب کو رستہ دکھا رہا ہوں

جہانِ علم و ہنر کے مالک میں تھک چکا ہوں
میں تھک چکا ہوں اور اب ترے پاس آ رہا ہوں

رواج پڑنے لگا ہے شہروں میں وحشتوں کا
میں حضرتِ قیس کی حدیثیں سنا رہا ہوں

کاشف واصفی

غزل

اُس نے آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیا جو کہنا تھا
لیکن اُس جزیرے پر چند روز رہنا تھا

کچھ سمجھ نہیں پائے، کچھ بھی کہہ نہیں پائے
وقت ایک دریا تھا، ہم نے صرف بہنا تھا

آنکھ کا تقاضا تھا، آنکھ نے نبھایا تھا
بے حسی کا پیراہن ہم نے خوب پہنا تھا

تم سمجھ نہ پاؤ گے، کیسے تم کو سمجھائیں
اِس غریب خانے میں کس نے آ کے رہنا تھا

بس نوید صادق بس، ختم کیجیے ماتم
اِس عمارتِ دل کو ایک دن تو ڈہنا تھا

نوید صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزل

دریا برد ہوا
پھول ، سوال ، دیا

اِدھر اُدھر مت دیکھ
خود سے آنکھ ملا

من مانی کی تھی
دل نے بھگت لیا

دنیا پل بھر کی
برسوں میں سمجھا

مرنے والوں نے
رستہ سہل کیا

گھور اندھیرے میں
اپنا آپ جلا

گھر اُجڑ تو کیا
بستی ، شہر بسا

سب کچھ چمکے گا
پہلے دل چمکا

دل پر داغ نہ دے
اے شفاف قبا

جو اعجاز سنے
اُس کو حال سنا

دل انگارہ ہے
جاں کو برف کیا

تجھ کو جیتنے میں
خود کو ہار دیا

روٹی پانی ہے
صبر و شکر کیا

اعجاز رضوی

جولی سیزر اور انطونی

وہ محل کے ہر راستے سے آگاہ تھا۔
خدا جانے وہ کدھر کدھر سے ہوتا ہوتا اوپر محل میں ''جولی سیزر'' کے سامنے آیا۔
اُس کے کندھے پہ اک ایرانی قالین تھا۔
رول ہوا ہوا۔
اُس نے ''جولی سیزر'' کو ادب سے سلام کیا اور کہا، آپ کی خدمت میں یہ ''ایرانی قالین'' حاضر ہے۔ اُس نے کندھے پہ پڑا قالین کا ''رول'' کھولا تو ''جولی سیزر'' کے سامنے اُس قالین کے بل کھلتے کھلتے، تم اپنے بل باندھتے، قالین کے اندر گھومتی ہوئی لیٹی اچھل کے سامنے آئی۔
اُف
''قلوپطرہ'' وہ تمہاری زندگی کا حسین ترین لمحہ تھا۔
دنیا کے کسی ''قالین'' نے کبھی اُس سے بہتر اپنے بل نہ کھولے ہوں گے، جب اُس قالین کے کھلتے کھلتے تم اُس کے اندر سے اُسی قالین کا سنہرا ترین پھول زندہ ہو کے ابھر آئی۔
وہ ''جولی سیزر'' جو روم سے دس سال ''فرانس'' فتح کرنے میں لگا رہا۔ جس نے روم سے مصر تک سارے جزیرے، سارے ملک فتح کر لیے تھے، وہ اُس قالین کے اندر سے ابھرنے والی ''گلاب کلی'' سے ہار گیا۔
''جولی سیزر'' نے تالی بجا کے، اپنے سارے فرماں برداروں کو کہا۔
تخلیہ۔
وہ رات صرف تم تھی اور ''جولی سیزر'' پتہ وہ اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا۔
جانتی ہو اُس رات کے ٹھیک نو مہینے بعد جولائی کے پہلے ہفتے میں تیرے نازک بدن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔
تم نے ''سیزر'' کی نسبت سے اُسے

ابدال بیلا

''سیزیرین'' کا نام دیا۔
''سیزیرین'' کی پیدائش تک ''جولی سیزر'' تمہارے ساتھ جڑا رہا تھا۔
ساری فتوحات اُس نے روک دیں۔ تیری وجہ سے سارے اُس علاقے میں لوگ امن کی نیند سوئے۔
وہ پل کے لیے بھی تم سے دور نہ ہوتا۔
اُس نے تمہیں ''ملکہ'' تسلیم کر لیا۔ تیرا بھائی مارا گیا تھا۔ چھوٹے بھائی سے تم نے رسماً شادی کر لی۔ تم ''فرعون'' کا لباس پہن کے ''جولی سیزر'' کو ساتھ لیے مصر پہ راج کرتی رہی۔
''جولی سیزر'' ''روم'' کا ہیرو تھا۔ ''روم'' والے ''جولی سیزر'' کے منتظر تھے۔ ''جولی سیزر'' روم کا تاج دار سمجھا جاتا تھا۔ مگر روم پہ جو حکمران تھا، وہ ''جولی سیزر'' کی مقبولیت سے خائف تھا۔
وہ تھا ''پوٹھی اعظم'' روم کا حکمران۔
پھر
''جولی سیزر'' سے ''پوٹھی'' کی فوج ہار گئی۔
بکھر گئی۔
خود ''پوٹھی'' بھاگتا، پناہ لینے کے لیے ''سکندریہ'' کی تمہاری بندرگاہ میں آ گیا۔
اُس کا بحری بیڑا سامنے تھا۔ اُس نے محل میں پیغام بھیجا۔ پیغام تمہارے بھائی کے تخریبی وزیر ''پوتھی نُوس'' نے سنا۔ اُس نے تمہارے بھائی سے صلاح کی کہ اگر اسے پناہ دی تو ''جولی سیزر'' ناراض ہوگا۔ نہ دی تو کیا پتہ بعد میں اسی ''پوٹھی'' کی فوج ''جولی سیزر'' پہ غالب آ جائے۔
اُس نے بہت خطرناک منصوبہ بنایا۔
ایک چھوٹی کشتی میں اپنی فوج کے اعلیٰ اہل کار کو بھیجا۔
اُس نے ''پوٹھی اعظم'' روم کے تاجدار کو دیکھ کے فوجی سلوٹ کیا۔ ادب سے کہا، آیئے ''یور ایکسیلینسی'' چھوٹی کشتی پہ بیٹھ کے ساحل پہ چلتے ہیں۔ یہ بھی عرض کیا کہ ساحل کنارے بڑے جہاز جانا مشکل ہے۔
''پوٹھی اعظم'' اپنے بڑے بحری جہاز سے اتر کے ''پوتھی نُوس'' کی بھیجی ہوئی چھوٹی کشتی میں بیٹھ گیا۔ جب بیٹھ گیا تو اُس کا ماتھا ٹھنکا، جب اُس نے ساحل کنارے ''مصری'' بڑے بحری جہاز آتے جاتے دیکھے۔
مگر اب وہ کشتی میں بیٹھ چکا تھا۔
کشتی کے چپو تیزی سے چل رہے تھے۔
کشتی کنارے پہنچنے والی تھی۔
جونہی کشتی کنارے پہ لگی۔
اُسی فوجی اعلیٰ افسر نے بڑے ادب سے تلوار اونچی کر کے اُس کا منتھا چومتے ہوئے ''پوٹھی اعظم'' کو بڑا سلوٹ کیا۔
اپنی دلی وفاداری کا فوجی اظہار کیا۔
پوٹھی اعظم، ''حکمران رومن ایمپائر'' کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔ اُس نے فخر و انبساط سے اِدھر اُدھر گردن گھما کے مصر

کا ساحل دیکھا، جو برسوں سے ''روم'' کا
باجگزار تھا۔
''پوچھی اعظم'' کا ایک قدم ساحل اور ایک
کشتی میں تھا اور وہ مسکراتے ہوئے جوابی
سلوٹ کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا کے ترچھا
سلوٹ کرنے لگا۔ اعلیٰ فوجی افسر کی سلوٹ
کے لیے اٹھی ہوئی تلوار گھومی اور ''پوچھی
اعظم'' کا سر گردن سے کٹ کے کشتی میں گر
گیا۔ دھڑ اُس کا ساحل اور کشتی کے بیچ پڑا
ایک دو جھٹکے لے کر بے سدھ ہو گیا۔
جولی سیزر جنگی مہموں میں شہر سے باہر تھا۔
جب ''جولی سیزر'' ''سکندریہ'' پہنچا، تو
تمہارے بھائی کے اُسی وزیر ''پوتھی نُوس''
نے ''جولی سیزر'' کو ''پوچھی اعظم'' کا سر اور
اُس کی نیلے نگینے والی شاہی انگوٹھی پیش کی۔
''جولی سیزر'' یک لخت لرز کے رونے لگا۔
اُس ایک لمحے میں وہ اندر ہی اندر کتنے
طویل رستے سے گزرا ہوگا۔
''پوچھی اعظم'' کے سر کی طرف نگہ تک نہ کی۔
''پوتھی نوس'' کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔
نیلے نگینے جڑی، روم کی حاکمیت والی انگوٹھی
اپنی انگلی میں پہن لی۔
دیکھ، قلوپطرہ، یہ ''انگوٹھیاں'' راج پاٹ کی
کتنی بے وفا ہوتیں۔
سر کہیں کٹا گرا ہوتا
جسم کہیں گر کے سڑ گیا ہوتا۔
''بے وفا'' راج کماری ''انگوٹھی'' کس کے
ہاتھ میں چمک رہی ہوتی۔
وہ کوئی معمولی انگوٹھی نہ تھی۔ اُس کا مطلب تھا
روم کا تاج۔
''رومن ایمپائر'' اُس انگوٹھی کے نگینے میں
اکڑوں بیٹھی تھی۔
''روم'' اب ''جولی سیزر'' کا تھا۔
اُس کا ولی عہد ''سیزیرین'' پیدا ہو گیا۔ ولی
عہد کے لیے بادشاہت بڑی ہو۔
اس کے اندر ''سکندر اعظم'' جاگا۔ یہ
''سکندر اعظم'' کی فتوحات کے دو سو سال
بعد کی تمہاری اور ''جولی سیزر'' کی کہانی ہے،
قلوپطرہ۔
ہے نا؟
وہ سوچتا، کسی طرح ہندوستان جا فتح کرے۔
دیکھ،
میرا ملک فتح کیے بغیر کسی کو ''فاتح اعظم'' کا
خطاب نہیں ملتا۔ مگر راہ میں ایران تھا۔
''ایران'' کی اُس وقت بھی مضبوط
حکومت تھی۔
وہ ''پارتھیا'' نام کی سلطنت تھی۔
جس کا ایک اہم شہر میرا ٹیکسلا بھی تھا۔
''جولی سیزر'' تمہارے ساتھ دنیا کو زیر
کرنے، ''ہندوستان'' تک پہنچنے کے
منصوبے بناتا رہتا۔
تمہارے ذہن میں پہلا سوال یہ تھا کہ پہلے
''روم'' کا بادشاہ تسلیم کر لیا جائے یہ۔ مگر
روم میں اُن دنوں ''جمہوریت'' کا جن اُبل

رہا تھا۔ ''جولی سیزر'' نے بھی دوسرے ''سینٹرز'' کی دیکھا دیکھی، اپنی اک پارٹی بنائی۔ خوب لوگوں میں لوٹا ہوا پیسہ بانٹا۔ جلوس نکلوائے، دھرنے دلوائے، بڑے ہاتھ پاؤں مارے۔

''ٹوسینٹرز'' ہوتے تھے۔ کل ''سینٹ'' میں جو فیصلے کرتے

اُن میں سے ''تین سو'' تو کھلے عام ''جولی سیزر'' سے مل گئے۔

بہت سے ''لوٹے'' بنے اندر سے ساتھ دینے کی بات کر چکے تھے۔

اب ''جولی سیزر'' نے ''مصر'' سے ''روم'' جانے کا پروگرام بنالیا، تمہارے ساتھ۔

تمہیں ''ملکہ مصر'' اور ''روم کی رانی'' بنا کے۔

''جولی سیزر'' کے بحری بیڑے میں سینکڑوں بحری جہاز تھے۔ بڑے بڑے اُس کے بادبانی جہاز تھے۔ انہی میں گھوڑے بھی چڑھ جاتے۔ ہزاروں اُس کے گھوڑے، گھڑسوار، نیزہ بردار، تلواروں سے لیس۔

روم جانے سے پہلے اُس نے آس پاس کے سارے جزیرے ہی فتح نہیں کیے، شمالی افریقہ کا بھی علاقہ جیت لیا تھا۔

''ایران'' کی ''پارتھیا حکومت'' سے ایک بار پنجہ آزمائی کی، مگر بہت نقصان اٹھایا۔

خود بھی اُدھر سے زخمی ہو کے بھاگا۔

مہینوں سکندریہ میں تمہاری گود میں سر رکھ کے لیٹا رہا۔

تم اُسے مصر دکھانے بھی ایک بار نکلی۔

یاد ہے؟

''نیل'' کے ڈیلٹا کی جو شاخ سکندریہ جاتی، اُسی پہ بہاؤ کے الٹ۔

تم اپنے سنہری سونے کی پتیوں سے جڑے بحری بیڑے پہ ''جولی سیزر'' کو ''فرعون بادشاہ'' کا لباس پہنوا کے، خود ''آئی سِس'' دیوی کی ''اوتار'' بنی، سر پہ دو سینگ اور ایک سورج کی پلیٹ سجا کے، سونے کی تاروں سے گندھے کپڑے پہن کے، اپنی رعایا دیکھنے آئی۔

''قلوپطرہ'' یاد ہے، تم نے یہ ''اہرام'' تب پہلی بار تب دیکھے تھے۔

تمہیں ''نیل'' کے اِدھر رہتے لوگوں کو دیکھنے کا بھی وہ پہلا موقعہ تھا۔

مگر اب تو ''جولی سیزر'' روم کا تاج دار تمہیں اپنی ملکہ بنائے، روم لیے جا رہا تھا۔

اُدھر ''جولی سیزر'' نے کئی روزہ جشن کا پروگرام بنایا تھا۔ وہاں تم نے ایک دیوہیکل فرعون کے مجسمے کے آگے سنہری تخت پہ سنہرا بانکپن پہن کے سر پہ ''آئی سِس'' دیوی کا تاج پہنے ''روم'' کے باسیوں پہ رنگ جمانا تھا۔

جما دیا۔

روم کے لوگ حیران، آنکھیں پھاڑے، ''مصر'' کی ''فرعونہ'' ملکہ قلوپطرہ تمہیں دیکھ کے پھٹ پھٹانے لگے۔ ایسا بے باک منہ

زور حسن، قوت اور طاقت کے ریشمی لبادے میں لپٹا، روم والوں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔
تمہیں اُس دن کا انتظار تھا۔
جب ''جولی سیزر'' اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ تمہیں ملکہ اپنی مانے، منوائے۔
روم کی سینٹ میں بھی کھلبلی تھی۔
اُن کو یہی خطرہ تھا کہ ''جولی سیزر'' اپنی بادشاہت کا اعلان نہ کر دے۔
افواج کا سربراہ وہ اسے مان چکے تھے۔
روم کا کرتا دھرتا بھی اسی کو مانتے۔
روم کا ''چیف ایگزیکٹو'' اسے ہی گردانتے۔
مگر ''روم'' میں بادشاہت ہو، یہ وہ ماننے کو تیار نہ تھے۔
سازشیں ہونے لگیں۔
''جولی سیزر'' کے دشمن بھی بہت تھے۔
''جولی سیزر'' نے قلوپطرہ تم سے پہلے روم کی تین عورتوں سے شادی کر کے طلاق دی ہوئی تھی۔ اُس وقت بھی ''جولی سیزر'' کی ایک بیوی روم میں موجود تھی۔
''کیلورنیا'' نام تھا اُس کا۔ تھی وہ بے اولاد
''جولی سیزر'' نے روم کے آئین میں دو بیویوں کے ہونے کی ترمیم کرالی تھی۔ اب وہ اس آئین کو لپیٹ کے ''بادشاہت'' کا اعلان کرنے والا تھا۔
''جولی سیزر'' کے وفادار ہزاروں تھے۔
مگر ایک افسر مدت سے اُس کے ساتھ تھا۔ وہ تھا،
انطونی۔
''قلوپطرہ'' یاد آیا، جس سے تمہارے باقی کے تین بچے ہوئے۔
مگر اُس وقت تو ''جولی سیزر'' روم کا حکمران، اپنی سینٹ میں گیا۔
وہ دن یاد ہے؟
لوگ کہتے تھے، بڑا منحوس دن ہے۔
کچھ ہونے والا ہے۔
تمہیں بھی ڈراؤنا خواب آیا تھا۔
کئی شہر کے لوگ سہمے اس صبح گھر سے باہر نہ نکلے۔
''جولی سیزر'' خود بھی لوگوں کی دیکھا دیکھی، دیر تک سینٹ میں نہ آیا۔
سینٹ میں ''قاتلوں'' نے ساز باز کر رکھی تھی۔ وہ گھبرائے کہ اُن کی سازش فاش نہ ہو گئی ہو، کہ اتنے میں ''روم'' کی افواج کا سالار اعظم، روم کا حکمران بنا، سجا سنہری پوشاک میں ملبوس ''جولی سیزر'' کے آنے کے بگل بجنے لگے۔ قاتل تو مایوس ہو کے بھاگنے والے تھے۔ چاقو خنجر انہوں نے پہلے سے سینٹ کے ڈیسکوں میں لا کے چھپائے تھے۔ مگر تم نے ساری کھیڈ الٹا دی۔ اپنے محبوب کو تم نے اُدھر چوم کے بھیج دیا۔
تم کیوں رونے لگی۔ اب۔
وہ واقعہ ہوئے تو دو ہزار سال سے اوپر کئی سال ہو گئے۔
ویسے ابھی جس زمانے میں پھر رہے، اُس

حادثے کو ہونے میں ساڑھے تیرہ سو سال پڑے ہیں۔
گھبرا کے رونے والی شکل کیوں بنائی ہوئی۔ دیکھ۔
''جولی سیزر'' اپنی کرسی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک ''سینٹر'' نے اٹھ کے ''جولی سیزر'' کے دائیں کندھے پہ چاقو سے وار کیا۔ ''جولی سیزر'' سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دو تین چاقو والوں نے اور وار کیا۔ خون میں لت پت ''جولی سیزر'' گر گیا۔ وہ اپنی تلوار نکال کے مقابلہ کرنے کیے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ ''جولی سیزر'' کا سب سے چہیتا ''بروٹس'' خنجر لے کے اُبھرا اور ''جولی سیزر'' کے قلب پہ وار کرنے ہی والا تھا کہ ''جولی سیزر'' نے ''بروٹس'' کو دیکھتے ہی کہا،
''بروٹس تم بھی''
بس ابھی بروٹس کا خنجر ''جولی سیزر'' کے قلب میں اترا بھی نہ تھا کہ اپنے سب سے چہیتے افسر، ''بروٹس'' کا اُٹھا ہاتھ خنجر تھامے ہوئے دل پہ وار کرتے دیکھ کے، دل وار ہونے سے پہلے ہی رک گیا۔ خنجر کی انی میں جولی سیزر کا مرا دل ہی پرویا گیا۔
کہنے والے کہتے تھے کہ ''بروٹس'' جولی سیزر کا ہی صلبی بیٹا تھا۔ جن دنوں وہ پیدا ہوا اُس سے مہینوں پہلے سے ''جولی سیزر'' کے ''بروٹس'' کی ماں سے تعلقات تھے۔
''جولی سیزر'' جانتا تھا بروٹس کون؟
''بروٹس'' بھی شاید جانتا ہو کہ ''جولی سیزر'' کون۔
مگر بات ''روم'' کو جمہوریہ رکھنے کی تھی۔
''قلوپطرہ'' تم روم میں تھی۔
تمہارا کیا حال ہوا ہوگا؟
تمہارے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔
تمہیں تو اپنی موت کا بھی خوف ہوگا؟
تھا نا؟
تبھی تم نے اپنے ''مصری'' بحری بیڑے کو فوراً ''سکندریہ'' کے لیے روانہ کر لیا۔
تمہیں ''روم'' کی قوت کا پتہ تھا۔
''جولی سیزر'' اپنے اور تمہارے ''سیزیرین'' کی بجائے اپنے ایک بھانجے ''ایکٹوین'' کو وصیت میں اپنا جانشین لکھ چکا تھا۔
''ایکٹوین'' کسی اور شہر میں پڑھ رہا تھا۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ایکٹوین''، ''جولی سیزر'' کا بھانجا ضرور تھا، مگر بیٹا بھی۔
وہ جو بھی تھا، روم آیا اور تخت پہ بیٹھ گیا۔
تم بھاگ کے سکندریہ آئی۔
روم کی فوج کا ایک بڑا دستہ جو ''جولی سیزر'' کا زیادہ وفادار تھا، اُس کی کمان اب ''انطونی'' کے پاس تھی۔
''ایکٹوین'' اور ''انطونی'' میں اب بلی چوہے کا تماشا شروع ہو چکا تھا۔
تمہارے وہ خواب جو ''جولی سیزر'' کے قتل سے ادھورے رہ گئے تھے، تمہیں ''انطونی'' کی شکل میں پورے ہوتے نظر آئے۔

ہے نا۔ قلوپطرہ؟
جولی سیزر جب قتل ہوا تو ساٹھ سے اوپر تھا۔
انطونی اُس وقت پینتیس سال کا لمبا موٹا تنومند جرنیل تھا۔
یاد ہے تم نے ”انطونی“ کو کیسے رام کیا؟
اُس نے تمہیں اپنے بحری بیڑے پہ دعوت دی۔ تم اپنا چمکتا شاہی بیڑا لے کے گئی، مگر اتری نا۔
وہ سب ساحل پہ میز کرسیاں سجائے تمہارا انتظار کرتے رہے۔ تم نہ اتری۔
پھر ان کی طرف سے پیغام آیا۔
آئیے۔ ”انطونی“ کی خواہش ہے کہ کچھ ٹھنڈے مشروبات پی لیجیے۔
تم نے سن کے پیغام بھجوایا۔
جنرل انطونی کے لیے ملکہ مصر کے بحری بیڑے پہ کھانے کا انتظام کیا گیا ہے، اُن کے سارے ساتھیوں سمیت۔
اُف۔
جب انطونی، اپنے دوستوں کے ساتھ تمہارے سنہری بحری بیڑے پہ پہنچا تو اُس کے اُوسان خطا۔ سنہری سونے سے گندھے کپڑوں میں ملفوف ہو کے بھی غیر ملفوف حسیناؤں کی قطار در قطار پھول پتیاں لیے اُن کے قدموں پہ گلاب اُگاتی کھڑی تھیں۔
کھانے کی میز جب سامنے آئی تو دنیا کا ہر کھانا موجود۔ ہرن کی بھنی ہوئی ٹانگیں، خرگوش کا اسٹو، مور کے ونگز، مرغی کے سینے کے تکے، بکرے کی چانپیں، سبزیوں کے الگ انبار۔ ہر شے سلیقے سے پیتل اور سونے کے جڑاؤ پتھروں کے ساتھ سجے برتنوں میں۔ شراب کا دور چلا تو ”قلوپطرہ“ تم خود ساقی۔۔۔
یاد ہے،
”انطونی“ کو تم نے اتنی شراب پلا دی کہ وہ رات، وہ وہیں تمہارے بحری بیڑے پہ رک گیا۔ اُس رات کے ٹھیک نو مہینوں بعد تم نے ”انطونی“ کے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ ایک لڑکا ایک لڑکی۔ لڑکی کا نام تم نے ”قلوپطرہ“ ہی رکھا۔
یاد ہے؟
”انطونی“ تمہارے محل میں پھر آ پڑا۔
”روم“ میں اُس کی باز پرس کے لیے ”رومی“ بحری بیڑا آ گیا۔ اُس میں ”روم“ کا ”تاجور“ ”اکٹوین“ خود موجود تھا۔
اُف،
دیکھ۔ تمہارا چہرہ کیسے پیلا ہو رہا۔ اُس وقت بھی تم خون سے نچڑی رہتی۔ تمہیں یہ دکھ تھا کہ ”اکٹوین“ تمہیں زندہ پکڑ کے ”روم“ کے بازار میں زنجیروں سے باندھ کے پھرائے گا۔
تمہیں خدشہ تھا، کہ تم نے ”روم“ کے ہر دل عزیز سالارِ اعظم ”رومن ایمپائر کے حکمران“ ”جولی سیزر“ کو بادشاہت کا خواب دکھایا تھا۔ خود ملکہ بننے کے لیے۔

''رومن ایمپائر اور مصر کی ملکہ''۔
تم سمجھتی تھی، تبھی ایکٹوین تمہارا ذاتی دشمن تھا۔ اسی لیے ساری روم کی قوت لے کر تم پہ آ چڑھا۔
تم ''انطونی'' کو حوصلہ دیتی۔
مگر وہ حوصلہ ہار چکا تھا۔
ہارا ہوا بندہ، مرا ہوا ہی ہوتا ہے۔
پھر ایک دن ''انطونی'' مارا گیا۔
''ایکٹوین'' تمہارے محل تک آ پہنچا۔
تم نے بہت سے ''زہر'' جانوروں اور انسانوں پہ آزما کے بُرے وقت کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ تم چاہتی تھی کہ کوئی ایسا زہر ہو جو آناً فاناً زندگی کی ڈور توڑ دے۔
''قلوپطرہ'' تم کیسے کرب سے گزری۔
نہ، اب نہ رو۔
تم نے اپنے لیے ایک مقبرہ بھی بنوایا ہوا تھا۔
اپنی جاں نثار چند عورتوں کو لے کر اور اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ اُس مقبرے میں آ ٹھہری۔
تمہارا بڑا بیٹا ''سیزرین'' سترہ سال کا ہو گیا تو تم نے کتنے جاہ وحشم سے اُس کی بلوغت کا جشن منایا تھا، اُس جشن کو گزرے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ ''ایکٹوین'' نے ''سیزرین'' کو مروا دیا۔
تم نے تو ''سیزرین'' کو ہندوستان بھیجا تھا کہ جاؤ، اُدھر کے راجاؤں کے ساتھ مل کر، کمک لے کر آؤ۔

دیکھ۔ قلوپطرہ،
تم شاید اُس وقت بھی مجھے جانتی تھی،
تبھی میری طرف اپنے بیٹے کو مدد لینے بھیجا۔ مجھ تک وہ پہنچ جاتا تو میں تجھے روم والوں سے تاراج نہ ہونے دیتا۔
قلوپطرہ یہ ضروری تھوڑی کہ میں کوئی راجہ ہوتا تو پھر تیرے کام آتا۔ تیری راہ میں مرنا بھی تیرے کام آنا ہی تھا۔ مگر ادھر تیرا ''سیزرین'' تیرا بیٹا راہ میں ''ایکٹوین'' کی فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔
تم اپنے مقبرے میں آ مقیم ہوئی تو تمہیں علم ہی نہ ہوا، کب ایکٹوین کے کچھ سپاہی دیوار کے اوپر چڑھ آئے اور تمہیں قید کر لیا۔
دیکھ ملکہ۔ دیوار اور پھاٹک پھلانگ کے آنے کی نمک حراموں کی پرانی عادت ہے۔
دکھی نہ ہو۔
ہر دکھ کو گزرتا دیکھ چکی ایک بار پھر اس دُکھ سے گزر جاؤ۔
وہ لمحہ کس قدر اداس ہے۔
جب ''ایکٹوین'' کے سامنے تم جاتے ہی گر گئی۔
کبھی ''جولیس سیزر'' کے سامنے تم کول گھومتی تڑپتی تڑپاتی ہوش رہائی کی شعاع بن کے ابھری تھی۔
اس دُکھی لمحے تم پھٹی ہوئی بوری کی طرح ٹھس سے گر گئی۔
''ایکٹوین'' اپنے تخت سے، جو نسل در نسل

تیرا مصر کا اپنا تخت تھا، اُس پہ چڑھا بیٹھا تھا،
تم اُدھر اُس کے پیروں میں جا گری۔ وہ اتر
کے تمہارے پاس آ بیٹھا۔
وہ "جولی سیزر" کو باپ ہی کہا کرتا تھا۔
تم نے اُسے یاد دلایا کہ جسے تو باپ کی طرح
یاد کرتا، جس نے اپنی وصیت میں تمہیں روم
کا راج دیا، وہ میرا نگہبان تھا۔ اُس کے بیٹے
کی میں ماں ہوں، جسے تم نے مروا دیا۔
"ایکٹوین" تمہیں بہتیری تسلیاں دیتا رہا
کہ ملکہ تم خودکشی نہ کرنا۔ میں تمہیں احترام
کے ساتھ "روم" لے کر جاؤں گا۔
مگر تمہیں پتہ تھا۔
"روم" میں اُس نے تمہیں باندھ کے
سڑکوں پہ تماشا دکھانا تھا۔
تم جانتی تھی۔
تم خاموش ہو گئی۔
اُسی مقبرے میں تم قید کر دی گئی۔
پھر یاد ہے، وہ شام۔
جب ایک دیہاتی مصری تمہارے لیے،
انجیروں سے بھری تنکوں کی بنی ٹوکری لے کر
آیا اور تم نے کہا۔
اور پھر تم آ ہی گئے۔
کہا تھا نا۔ بول قلوپطرہ؟
اُسی ٹوکری میں وہ سبز رنگ کا چھوٹا سا انتہائی
زہریلا اُفعی سانپ تھا، جو تین انجیروں کو
کھانے کے بعد تم نے، اپنی زبان سے
اُسے چومتے ہوئے، اپنے ہونٹوں پہ کٹوایا
اور آناً فاناً وہاں ہوتے ہوئے بھی، وہاں
سے چلی گئی۔
وہی "ایکٹوین" "عظیم رومن ایمپائر" کا پھر
خود بادشاہ بن گیا اور اپنا خطاب "آگسٹس"
رکھ لیا۔
دیکھا۔
فرق
ڈبل سٹینڈرڈ
تمہارے لیے قانون اور، تم جو ان کے
قانون کے نیچے بھی نہیں تھی۔
مصری ملکہ کو اُس کی زندگی میں "روم" کی
سڑکوں پہ بے بسی کی تصویر بنا کے نہ پھرا سکا۔
تمہارا ایک سنہری مجسمہ بنا کے اُسے زنجیریں
پہنوا کے بازاروں میں پھرایا گیا
تم پہ الزام تھا کہ جولی سیزر کو بادشاہت کا
خواب تم نے دکھایا تھا۔
دیکھو۔
تمہیں یہ سزا خود آئین توڑ کے بادشاہ بننے
والا دے رہا تھا۔
وقت تماشے کرتا رہا، مگر تم اُسی مقبرے میں
سما گئی جو تم نے اپنے لیے بنوایا تھا۔
"قلوپطرہ" زندگی کو موت سے یوں چوم
کے ہونٹوں سے تمہارے علاوہ کوئی اور گزرا
ہو تو بتاؤ؟
تم کہہ سکتی ہو۔
"ہم سا ہو تو سامنے آئے"۔

☆☆☆☆☆

آخری امیدوار

نجم رضوی

رضوانہ جب نماز کے لیے اٹھی تو اُس کی ماں اُس سے پہلے ہی مصلے پر تھی۔ نماز کے بعد دُعا میں وہ آنکھیں بند کیے مراقبے میں چلی گئی ۔ آواز تو نہیں آ رہی تھی لیکن رخساروں پر پھسلتے آنسو اُس کی زبان بن گئے تھے۔

نماز ختم کرتے ہی رضوانہ نے ماں کی پیشانی پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے، ''ماں!..... دُعا کرنا'' ''ڈھیر دُعائیں..... میری جان!! بھلا ماں سے بھی کہنے کی ضرورت ہے!!''

آج اُس کے خواب پورے ہونے کا دن تھا۔ اُس نے تحریری امتحان پاس کر لیا تھا۔ اُس کا لیکچرر شپ کا انٹرویو تھا۔ اُس کی منزل اور خواہشات کی تکمیل میں صرف سیڑھی کا ایک ہی پائیدان حائل تھا۔ بس ایک جست کی ضرورت تھی۔ اِس لئے وہ کچھ پریشان بھی تھی اور فکر مند بھی۔ جب ماں کی دعاؤں کی چھاؤں میں، ماتھے پر ممتا کے بُوسے کا جھومر سجائے گھر سے نکلی تو وہ بڑی پُر اُمید دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بس میں سوار ہو گئی۔ انٹرویو کی جگہ وقت پر پہنچنا تھا۔ یہ فاصلہ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت پر تھا۔ وہ سیٹ پر آرام سے بیٹھ کر ذہن میں

کبھی چند ضروری سوالات دوہرانے لگتی اور کبھی اپنے تعلیمی سفر کے اہم موڑ یاد کرتی۔

خداوند قدوس نے اُسے بہت زرخیز ذہن دیا تھا۔ محنت اُس کی گھٹی میں شامل تھی اور وہ تھی بھی اپنے والدین کی بھرپور توجہ کی ماحاصل۔ اُس کا باپ خاص طور پر ہر نئی چیز کے بارے میں اُسے اہم معلومات فراہم کر کے اُس کی تربیت کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور مسکرا کر کہتا، میرا بیٹا! پتا ہے؟.....

میں تجھے ہر مسئلہ میں گائیڈ کرتا رہتا ہوں ..... بچے کا ذہن زرخیز مٹی کی طرح ہوتا ہے اور اس میں جو بُو یا جائے وہ اُسے قبول کر لیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری کمسنی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤں!!' اپنے والد کی یہ باتیں رضوانہ نے پلے باندھ لی تھیں۔ اُس کے تعلیمی سلسلہ میں کئی ایک اُتار چڑھاؤ آئے اور اُس کی تعلیم متاثر ہوئی۔ رضوانہ ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کا والد بیمار رہنے لگا۔

رضوانہ نے میٹرک کا امتحان ابھی دیا ہی تھا کہ اُس کے والد اچانک شدید بیمار پڑ گئے۔ بلڈ پریشر اور شوگر تشخیص ہوئی۔ کچھ عرصہ بیماری کاٹنے کے بعد وہ وفات پا گئے۔ اُن کی موت تو تھی ہی ناقابل برداشت صدمہ لیکن اِس سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ وہ شہر میں اپنا آبائی گھر بھی بیچ چکے تھے۔ اِس امید سے کہ آدھے پیسوں کا گھر بنا لیں گے اور باقی رقم سے قریبی قصبہ میں کوئی کاروبار کریں گے۔ سارے کام رُک گئے اور ہر پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ قصبہ میں ان کے قریبی عزیز تھے جن کے پڑوس میں وہ آ بسے تھے۔ ساری جمع پونجی اُن کے ہاتھ میں تھی اور وہ اِس عرصہ میں خرچ ہونے لگی۔ جھوٹا سچا، رسماً افسوس کرنے والوں کا بوجھ، پھر جھوٹی اور فضول سی معاشرتی رسومات۔ جن کا متوسط طبقہ ضرورت سے زیادہ خیال رکھتا ہے اور اوپر سے پانچ بچوں کا بوجھ۔ کچھ ہی عرصہ میں اُن کے لیے اِس قصبہ میں قلیل رقم سے سر چھپانے کے لیے اپنا آسرا خریدنا مشکل ہو گیا اور جس مکان میں وہ رہ رہے تھے اُسی مکان میں مستقل کرایہ دار بن گئے۔

بے رحمی کے دَور کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے جو چیز قطع ہوئی وہ صلہ رحمی کی گرہ تھی۔ پھر زندگی کا بپھرا ہوا سمندر اور تلخ حقیقتیں۔ زندگی کے اِس سمندر میں تیرنا تھا اور وہ بھی ناقابل اعتبار پتوار کے ساتھ۔ میٹرک کا شاندار رزلٹ اس کی پڑھائی چھوڑنے میں مانع تھا۔ رضوانہ کی خالہ اور خالو جن کے پاس وہ اِس قصبے میں آئے تھے اور جن کی ضمانت اور وساطت سے مکان کرایہ پر لیا تھا وہ اُن کی محنت اور مدد سے ایف۔ ایس۔ سی کے بعد پرائیویٹ بی۔ اے کرنے کی کوششوں میں لگ گئی۔

جب اُس نے ابھی بی-اے کے پیپرز دیئے ہی تھے- وہ رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی اور موسم گرما کا موسم چل رہا تھا تو وہ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے سہیلیوں کے ساتھ قریب ہی واقع ایک لیبارٹری میں نوکری کیلئے چلی گئی- باری باری وہاں موجود سب لڑکیوں کے انٹرویو ہوئے- بہت ساری لڑکیوں کو کام پر رکھ لیا گیا لیکن عجیب اتفاق تھا کہ لیبارٹری والوں نے رضوانہ کو ملازمت نہ دی- وہ اعتماد کی دولت سے مالا مال تو تھی ہی لہٰذا وہ انٹرویو کے بعد انٹرویو کرنے والے صاحب کے پاس گئی اور نوکری پر نہ رکھے جانے کی وجہ پوچھنے لگی- اُس لیبارٹری میں ڈاکٹر جعفری صاحب تھے- وہ پرتپاک طریقے سے ملے- اُسے بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی گئی- پیار سے بولے، ”بیٹا! اپنی ایف-ایس-سی کی سند غور سے دیکھی ہے کیا؟ .... 1100 میں سے 756 نمبرز حاصل کیے ہیں تم نے......میں نہیں چاہتا کہ یہ معمولی نوکری دے کر تمھارا مستقبل تاریک کر دوں!! اکثر والدین نوکری ملنے کے بعد کہتے ہیں......چلو چھوڑو...... آگے کیا پڑھانا ہے......... پیسے آ رہے ہیں اور وہ بھی وقتی خوشی اور آسائش کو ترجیح دینے لگتے ہیں اس طرح بہت سارے طالب علموں کا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے۔“ اُنھوں نے مشورہ دیتے ہوئے نہایت ادب سے کہا، ”میرا بیٹا! اگر کوئی گھریلو مسئلہ ہے تو یہ لیبارٹری والے کیا دیتے ہیں...... معمولی تنخواہ......تم گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھا لیا کرو......تمھارے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا......لیکن پڑھائی کے دوران میں پڑھانے کے حق میں بالکل نہیں ہوں...... پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو!“ جعفری صاحب کی باتیں رضوانہ کی سمجھ میں آ رہی تھیں-

رضوانہ کا بی-اے کا رزلٹ بہت اچھا آیا- اُس نے ۸۵ فیصد نمبرز حاصل کیے- اُردو اختیاری میں اُس نے 200 میں سے ایک سو چالیس نمبر حاصل کیے- بی-اے کے بعد کی تعلیم تقریباً اُس کی پہنچ سے باہر تھی - اُوپر سے وہ خود تھی بھی حساس طبیعت کی مالک، ماں کو کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے اور لوگوں کے کپڑے سلائی کرتے دیکھتی رہتی- یہ سب کچھ رضوانہ کے لئے ناقابلِ برداشت تھا- وہ مزید پڑھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اُس کی نانی نے اپنا سارا زیور بیچ کر اُس کے لئے پیسوں کا انتظام کر دیا- ماں اور نانی کے اصرار پر وہ بھی اعلیٰ ڈگری کی پڑھائی کے لئے رضامند ہو گئی- وہ سوچ رہی تھی کہ کسی مقام پر پہنچ کر وہ اپنے خاندان کی بہتر مدد کر سکتی ہے- وہ اِس حق میں تھی کہ اگر پڑھنا ہی ہے تو ریگولر

ہی پڑھنا ہے۔ اُس نے یونیورسٹی میں ایم۔ اے اُردو میں داخلہ لے لیا۔ اُردو اختیاری مضمون میں اچھے نمبرز لینے پر اُس کو چھ ہزار روپے نقد انعام ملا جس سے ساری فیملی نے نئے کپڑے بنائے اور یونیورسٹی کی طرف سے اُس کے لئے بارہ ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ رضوانہ کو یونیورسٹی میں اچھے اساتذہ مل گئے۔ اُس کو محنت کرنے کا خوب مزہ آنے لگا۔ تعلیم میں تو اُس کو کوئی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا لیکن یونیورسٹی کا ماڈرن ماحول۔ کلاس فیلوز کے زرق برق لباس....... باتوں باتوں میں اسلام آباد کی باتیں....... United States کے تذکرے........... پاپا نے میرے لئے یہ منگوایا.......وہ منگوایا...........یہ گاڑی ....وہ گاڑی......فارغ پیریڈ میں گپیں ہانکی جاتیں....... get to gether ہوتی...... جیسے کنٹری بیوٹ ہوتے .... موسم اچھا ہوتا.... کنٹین پر محفلیں سجتیں...... قہقہوں کے درمیان بوتلیں کھلتیں....... چائے پی اور پلائی جاتی۔ پیسہ پانی کی طرح خرچ ہوتا۔ اس ماحول میں اُس کا سانس گھٹنے لگتا۔ اُس کی حالت عجیب ہو جاتی....... حصہ نہ لیا جاتا تو احساس کمتری ....حصہ لیا جاتا تو بھی احساس کمتری........ عجیب عجیب کمنٹس پاس ہوتے۔ اُس کو اپنی ماں کا چہرہ کہیں سے جھانکتا دکھائی دیتا۔ یونیورسٹی میں بیتے لمحے تو کمزور لمحے ہوتے جب اپنے کلاس فیلوز میں بیٹھے بیٹھے اُس کا رنگ زرد پڑ جاتا اور وہ پریشان ہو جاتی۔

ایم۔ اے کا سفر بھی آخر ختم ہوا۔ ایم۔ اے کے پیپرز ہوئے اور اُس نے پارٹ 1، پارٹ 2 کا امتحان مجموعی طور پر فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ گھر سے جو سفر شروع ہوا تھا آخر گھر تک پہنچ گیا۔ ایم۔ اے کرنے کا بھی اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔ ایم۔ اے میں داخلہ لے کر اور ایم۔ اے مکمل ہونے تک اور پھر اُس کے بعد کا دور بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایم۔ اے اور وہ بھی پنجاب یونیورسٹی جیسے ادارے سے، تو بندے کا مورال بلند ہوتا ہے۔ اُس کی باتوں میں اعتماد جھلکتا ہے۔ محفل میں بیٹھے ہوئے اگر بتانا پڑتا تو سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ ’جی! یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر رہا ہوں۔‘ یہ سرور ایک عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد رزلٹ آنے کی خوشی اور ملازمت کے حصول کا وقت یہ بھی سنہرے ادوار ہوتے ہیں۔

رضوانہ کا مورال بلند تھا۔ اخبارات میں ملازمت کے لئے اشتہارات دیکھنا اُس کی ایک اہم مصروفیت بن گئی۔ دوستوں میں بیٹھے ہوئے اُن سے گپ شپ ہوتی اور

تنہائی میں بلند و بالا ارادے باندھے جاتے۔ سی۔ ایس۔ ایس، پی۔ سی۔ ایس، کے سنہرے دل موہ لینے والے خواب دیکھے جاتے۔ اُسے لگتا کہ یہ امتحانات پاس کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مشکل کام تو ڈی۔ ایم۔ جی یا کسٹم گروپ کا حاصل کرنا ہے۔ کسی کے کہنے میں آ کر سی۔ ایس۔ ایس کی تیاری شروع کی جاتی اور کبھی وہ روک کر لیکچرار شپ کی۔ اس طرح چند مہینے گزر گئے اور پھر سال ڈیڑھ سال کا عرصہ مزید گزر گیا لیکن اُس کو کوئی مناسب ملازمت نہ ملی۔ اس عرصہ میں سی۔ ایس۔ ایس کے امتحانات آئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک عرصہ ملازمت پر بین کے بعد پبلک سروس کمیشن کا لیکچرار کا امتحان سر پر آ گیا تھا۔ تحریری امتحان پاس کر لیا گیا۔ اُس کو انٹرویو کی کال آئی۔ انٹرویو نصف گھنٹہ چلا۔ اندر سے وہ بہت خوش تھی کہ سوالات اُس کی پسند کے اور اچھے تیار کردہ تھے۔ اچانک چیئرمین نے انٹرویو کے آخر میں ایک اختلافی سوال پوچھ لیا۔ وہ بچاری کہتی رہی اِس کے متبادل کوئی اور سوال پوچھ لیں۔ رضوانہ کا دیا گیا جواب اُن کو پسند نہ آیا۔ انٹرویو کے دوران ہی اُس کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کو نہیں رکھیں گے۔ ویسے ہی ہوا۔ چھوٹی سی بات کی اُس کو بہت بڑی سزا دے دی گئی۔ حالات عام ڈگر پر چلنے لگے۔

ملازمت کے حصول میں دشواری اُس کا حوصلہ پست کرنے لگی۔ اُس کا مورال پست ہونے لگا اور قابلیت ہونے کے باوجود اس کا اعتماد کم ہونے لگا اور وہ شک کا شکار ہونے لگی۔ جب اُس کے خواب بکھرنے لگے تو وہ بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ اُدھر گھر میں ماں کا بھاگم بھاگ کام کرنا رضوانہ سے دیکھا نہ جاتا تو اُس نے ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔

جب بے روزگاری کی مایوسی مزید بڑھی تو رضوانہ نے کسی پرائیویٹ سکول میں پڑھانے کا ارادہ کر لیا۔ رضوانہ کی ماں اُس کے گھر سے باہر نکلنے اور مردانہ ماحول میں مکس ہونے کے خلاف تو تھی لیکن انتہائی مجبوری میں اب وہ اجازت دینے پر مجبور تھی اور یہ غیور بیٹی اپنی ماں کی مجبوریوں سے بھی آگاہ تھی۔ گھر کے ناقابل بیان اور ناقابل برداشت اخراجات اُس کے سامنے تھے ایسے حالات میں گھر بیٹھنا، اُس کو بے غیرتی لگتی۔ ایک طرف بھاگ بھاگ کر غموں کی ماری، غموں کا مقابلہ کرتے والی ماں..... لوگوں کے کام کر کے اپنی بینائی اور ٹانگیں تھکا دینے والی غیرت مند خاتون تھی۔ ماں اُسے ہمت اور عمل کا استعارہ لگتی جس نے خاوند کی وفات کے بعد بجائے خود بکھرنے کے اپنے آپ کو

بچوں کے لیے سمیٹا۔ حقیقت کو خندہ پیشانی سے اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کیا اور کسی رشتہ دار کی طرف لپکائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھا۔ دوسری طرف اُس کی خود دار بیٹیاں ایف۔ اے، میٹرک اور آٹھویں میں پڑھ رہی تھیں۔ بہنوں سے چھوٹا اکلوتا بیٹا پرائمری میں تھا۔ چار چھوٹے بچوں کو دیکھ کر وہ سسکتی رہتی اور کہیں نہ کہیں کام کرنے کے لیے نکل کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ماں کی ہمت پر حیران ہوتی۔ جس کے پانچ بچے، خاوند کی بیماری، اُس پر خرچ اور اُس کی موت پر خرچ۔ آخر کار اب بے سروسامانی اور کرائے کے مکان کی زندگی۔ ایسے میں گھر کے اخراجات، ہر لحظہ بڑھتی مہنگائی، اُسے ماں کوئی ہمت کا دیو مالائی کردار لگتی۔

اُس کی ماں اُس کی آئیڈیل تھی۔ ماں کی زندگی پر اُسے رشک اور ترس ایک ساتھ آتا۔ اِن حالات میں رضوانہ نے گھر کے قریب ایک انگلش میڈیم سکول جوائن کر لیا۔ جہاں تنخواہ تو کوئی زیادہ نہیں تھی لیکن سکول انتظامیہ کی ساکھ اور پڑھائی نسبتاً بہتر تھی۔ اب وہ مجبوری کی زندگی کو جاننے لگی۔ وہ باہر کی سخت دنیا اور حالات سے واقف ہوئی۔ وہ حیران ہوتی کہ کیسے اُس کی ماں گھر کے اخراجات چلا رہی تھی۔ گھر شاید تین وقت کے کھانے کے بغیر تو چل سکتا تھا لیکن مالک مکان کو بروقت کرایہ دیئے بغیر نہیں۔ خطرے کی یہ تلوار اُن کو ہمیشہ اپنے سروں پر لٹکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ سال کے مہینے تو پنگھوڑے کی ڈولیوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے چلے آتے۔ گھر بہت چھوٹا اور معمولی تھا لیکن بہرحال گھر تو تھا۔ کرایہ بھی کم ہی تھا لیکن ان کو یہ ایک بوجھ لگتا کیونکہ یہ کرایہ بہرحال پانچ بچوں کی بیوہ ماں کو ہی ادا کرنا ہوتا تھا۔ پانی بجلی اور گیس کے بل جو انتہائی لاپرواہی سے اُن کے کھاتے میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ یہ تو ان کے لیے زندہ رہنے کا سودا تھا جسے انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے چکانا پڑتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کسی مہینے بجلی کا بل رہ جاتا اور کسی مہینے گیس کا۔ رضوانہ کی ماں جب کبھی چند دنوں کے لئے بیمار پڑ جاتی تو اُسے زندگی کی تلخی کا احساس ہوتا۔ ذمہ داری بڑھ جاتی اور اس بوجھ سے بیٹی کے ناتواں کندھے جھکنے لگتے۔ رضوانہ کی بہنوں کو بھی اپنی ماں کا احساس تھا۔ وہ بیچاریاں دن کے وقت چھوٹے سکولوں میں ہزار، دو ہزار پر پڑھاتیں اور سیکنڈ ٹائم، اکیڈمیوں میں خود میٹرک، ایف۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ حساس طبیعت کی مالکہ، رضوانہ دن بھر پتہ نہیں کتنی دفعہ مرتی اور کتنی دفعہ جیتی۔ اِس لئے ہی تو پریشان ہو کر اُس نے کہا تھا، 'اللہ کرے کسی کا باپ نہ مرے ..... اور کوئی یتیم نہ

ہو.....اگر ہو بھی تو.....بڑی بیٹیاں نہ ہوں بلکہ بیٹا ہی بڑا ہو!!' رضوانہ کی ماں اپنی چار بیٹیوں کو رات کو چادریں لپٹاتی.....لیٹی ہوئی بیٹیاں اُسے کتنی لمبی لگتیں.....اُن کی لمبی لمبی ٹانگیں .....تمام بہنیں اُس کو ایک ہی جتنی لگتیں.....اُن کو دیکھ کر وہ سوچوں میں گم ہو جاتی- اُن کے ہاتھ پیلے کرنے کے خیال سے ہی ساری ہلدی اُلٹا اُس کے چہرے پر ہی گر جاتی- ماں رات کو اکثر کھانستی رہتی- صبح ماں کی سوجھی آنکھیں دیکھ کر رضوانہ کو اندازہ ہو جاتا کہ وہ ساری رات نہیں سو سکی- رضوانہ کو لگتا کہ شاید وہ زندہ رہنے کی سب سے زیادہ قیمت چکا رہے تھے- عجیب بے بسی تھی- نہ کوئی اپنا اور نہ کوئی بیگانہ- نہ کوئی پڑوسی کام آتا اور نہ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا تھا- سب اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھے- کرایہ تو ہر سال بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا- اِن حالات میں روشنی کی کوئی کرن تھی تو وہ اُس کے خالہ اور خالو تھے- جو اُس محلے میں رہتے تھے- اُن کا سہارا اُن کو ڈوبتے کو تنکے کا تھا- نانی تو ان کے ہاں مستقل ہی چلی آئی تھی کہ گلشن کا کاروبار چلتا رہے- اب رضوانہ کو پتا چلا کہ غربت کیا معنی رکھتی ہے- اُس کے بچپن میں جب اُس کا باپ اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتا- اُن کو باہر دکان پر لے جاتا اور ڈھیر ساری چھوٹی چھوٹی چیزیں لے کر دیتا- چاہے وہ معمولی سی ہی ہوتیں- واپسی پر ماں مذاق سے کہتی، ''تا کیا کر ان سے اتنا پیار.....چوڑ نہ کر دینا اِن کو.....یہ بیٹیاں ہیں..... سر پر نہ چڑھایا کر-- آخر ایک دن پرائے گھر جانا ہے انہوں نے!!'' چھوٹی بیٹی کا ماتھا چومتے ہوئے اُس نے اپنی بیوی کا نام لیتے ہوئے کہا تھا، ''زلیخا! نہ سوچا کر ایسا.....یہ میری بیٹیاں نہیں بیٹے ہیں.....!!'' رضوانہ کے باپ نے اِس بار اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا، ''یہ تو میرا شیر پتر ہے.....ماشاء اللہ بہت سمجھدار ہے.....یہ اُداس بیٹھی مجھے اُداس کر دیتی ہیں!! جب بیٹیاں پرے چلی گئیں تو اُس نے کہا تھا، ''زلیخا! اِن میں اپنا آپ دیکھتا ہوں.....جب میں چھوٹا تھا اور گاؤں میں رہتے تھے- غربت کی زندگی گزارتے تھے- ایک دن مسجد میں اعلان ہوا.....گڑ والے میٹھے چاول بانٹے جا رہے ہیں- لے جاؤ.....!! میں بھی باہر کھیل رہا تھا- وہاں سے گھر آیا.....تھالی اٹھائی اور مسجد کی طرف بھاگا- ڈھیلا ڈھالہ کھچا پہنا ہوا تھا- مسجد کے دروازے پر نمودار ہوا، دُور سے ہی دیگ پر بیٹھے، چاول بانٹتے چاچے تاجے نے آواز لگائی.....''چل دفعہ ہو جا..... ٹانگیں ڈھانپ کر مسجد میں آتے

ہیں...... ٹانگیں ڈھانپ کر آ!!" میں جلدی سے واپس گھر بھاگا۔ گھر سے کوئی پھٹی پرانی شلوار پہنی اور واپس مسجد پہنچا۔ میرے مسجد پہنچنے سے پہلے ہی چاول ختم ہو چکے تھے اور میں نامراد واپس لوٹا!!....... ماں سے خواہ مخواہ لڑتا رہا..... ماں!.... تیرے فلاں رشتہ دار نے مجھے میٹھے چاول نہیں دیئے...... اور کافی دیر روتا رہا!! باپ نے کہا تھا،" زلیخا! میری ماں نے جھٹ کہا..... لے میرے چاند...... ابھی تیرا ابا آتا ہے...... میں ابھی گڑ منگوا کر تجھے میٹھے چاول پکا دیتی ہوں!.......... نہ جلدی ابا آیا اور نہ میٹھے چاول پکے........ میں پتہ نہیں کتنی دیر رویا اور سو گیا لیکن پتہ نہیں کتنے دن ہمارے گھر میٹھے چاول نہ پکے یہی محرومی کسک بن کر میرے کردار میں رینگتی رہی......... میں نہیں چاہتا میرے بچے کسی محرومی کا شکار ہوں...... کوئی روگ پالیں....... میں ان کو بازار لے جاتا ہوں........ ڈھیروں چیزیں لے دیتا ہوں........ جو چیزیں مجھے نہیں ملیں انہیں تو ملیں.......!! وہ چیزیں چاہے معمولی معمولی ایک ایک روپے کی ہوں۔ زلیخا! میری بیٹیاں اتنی اچھی ہیں۔ کبھی ضد نہیں کرتیں کہ یہ لے دو .... وہ لے دو..........!! جو چیزیں لے دیتا ہوں لے لیتی ہیں....... جب کہتا ہوں آج پیسے نہیں ہیں........ تو یہ بڑی کہتی ہے، بابا! جب پیسے ہوں گے لے لیں گے۔ جب میں اپنے بچوں کو چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی نہیں لے کر دیتا تو مجھے لگتا ہے کہ موت کسی کم تکلیف دہ شے کا نام ہے!!"

بس میں بیٹھی وہ اپنے سکول کے بارے سوچ رہی تھی جس نے اس کو سپورٹ کیا تھا۔ سکول اچھا تھا کیونکہ ادارہ ہوتا ہے سربراہ سے اور سکول کی سربراہ تو ایک ہنس مکھ عورت تھی لیکن ایڈمنسٹریٹر مرد تھے۔ سچی بات ہے جیسا سربراہ ہو ویسا ہی مدرسہ روپ دھار لیتا ہے اگر وہ محنتی اور قابل ہو تو سکول میں تعلیمی ماحول پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی معیار بلند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر سربراہ نالائق، کام چور اور سست ہو تو ادارے کے دیگر اساتذہ بھی کام چھوڑ دیتے ہیں۔ ادارے میں سربراہ کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی ہی یہ نئی سربراہ تھی۔ ہاں ایڈمنسٹریٹر کبھی کبھی سختی کر لیتے تھے اور کوئی ہارش لفظ بول جاتے لیکن وہ بھی کبھی کبھار ہی۔ سربراہ نے ماحول اچھا بنا دیا تھا۔ رضوانہ سکول کے پلس پوائنٹ سوچ رہی تھی۔ لیڈیز سٹاف تھا۔ تنخواہ مناسب تھی۔ سکول گھر سے دور نہیں تھا۔ کرائے اور وقت کی بچت ہو جاتی تھی۔ پہلے دو سکول اس نے انتظامیہ کے برے رویے کی وجہ سے چھوڑے تھے۔ ٹیچرز اس سے پیار

کرتی تھیں۔ گھر جیسا ماحول تھا۔ ایک دوسرے کا احترام اور ایک دوسرے کا کام بانٹ لینا سکول کے کلچر میں شامل تھا۔ اِس لیے وہاں کام کرتے اُسے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

رضوانہ بس سے اُتری اور رکشہ پر اپنی منزل مقصود کے لیے چل پڑی۔ سوشل سیکورٹی کے ہیڈ آفس (ایجوکیشن ونگ) جانا تھا جہاں دس بجے انٹرویو ہو رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ Confidence is the key to success اپنے مورال اور کونفیڈنس کو بہتر بنانے کے لیے وہ مثبت باتوں کے بارے سوچ رہی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کی گذشتہ کامیابیوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میٹرک میں سائنس میں داخلہ لینے کے لیے جب وہ سکول گئی تو ہیڈ مسٹریس نے اُس کا ٹیسٹ لیا تھا۔ اُس کی ہینڈ رائٹنگ بہت اچھی تھی۔ ٹیسٹ میں اُس نے اُردو میں مضمون 'چاندنی رات کا نظارہ' اور انگلش میں، مائی سکول، مضمون لکھا تھا۔ اِن مضامین کو ہیڈ مسٹریس نے اپنے پاس دراز میں رکھ لیا تھا۔ جب کوئی کسی لڑکی کی سفارش کرنے آتا تو وہ آگے سے دراز میں سے اس کا ٹیسٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہتیں، 'یہ دیکھیں...... ایسے بچے اگر کسی سفارش کے بغیر بھی آجائیں تو میں بخوشی رکھ لیتی ہوں...... جو بچہ ٹیسٹ ہی نہیں پاس کر سکتا اُس کو میں کیسے پڑھاؤں گی۔' اپنی اِس سوچ سے وہ خود ہی مسکرا دی۔ اُس نے یاد کیا جب اُس نے پی۔ سی۔ ایس کا امتحان کوئی اچھی تیاری سے نہیں دیا تھا۔ اُس نے اُردو کا مضمون، ادب اور زندگی، پر لکھا تھا اور اُس نے ۷۰ فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگی، عظیم شاعر، محسن نقوی نے یونیورسٹی کے مضمون کے پیپر میں ۸۰ نمبر حاصل کیے جواب تک ایک ریکارڈ ہے اور مضمون بھی تھا، مرزا انیس اور دبیر کی مرثیہ نگاری کا موازنہ۔ اپنے نمبروں کو یاد کر کے وہ مسکرا دی۔ یہی مضمون اُس کو سوشل سیکورٹی، انٹر گرلز کالج، کی اُردو کی پوسٹ کے لیے آیا تھا۔ وہ اس کو دوہرانے لگی شاید انٹرویو میں پوچھ لیں۔ ادب اور زندگی، ادب کیا ہے؟ ادب زندگی سے نکلتا ہے۔ ادب ---- زندگی پر ہی پرورش پاتا ہے۔ اور ادب ---- زندگی کو ہی متاثر کرتا ہے۔ رضوانہ کی اُردو بہت اچھی تھی۔ ایک وقت میں وہ تین ہزار کے قریب اشعار زبانی سنا سکتی تھی۔ اُس کو خوشی تھی کہ جب سکول کے سالانہ فنکشن میں اُس نے انگلش میں کمپیئرنگ کی تھی تو سب کو حیران کر دیا تھا۔ اپنے منفرد لب و لہجہ کی وجہ سے خوب داد وصول کی

تھی- فنکشن کے بعد میٹنگ میں میڈم نے اس کی خوب تعریف کی تھی، 'شاباش--- تم نے تو ہم سب کی لاج رکھ لی - فنکشن اپنے نام کروا لیا---- کیا انداز تھا---!وہ رُک کر سنجیدہ ہوئیں اور کہا، میں دعویٰ سے کہتی ہوں کہ اگر تم تھوڑی سی محنت کرو تو سی- ایس- ایس کا امتحان پاس کر سکتی ہو-' اور کافی دیر اثبات میں سر ہلاتی اور اپنی عینک درست کرتی رہیں-

رضوانہ جانتی تھی لیکن کیا کرتی زندہ رہنے کے لیے صبح سے رات تک پڑھانا ہی پڑھانا تھا- اس حالت میں رات کو تھکے ہوئے جسم و ذہن کے ساتھ پڑھنا بہت مشکل تھا- وہ تو پڑھنے کے لیے چھٹی بھی نہیں کرتی تھی - وہ چھٹی کے معنی جانتی تھی----- جتنی چھٹیاں--- اتنے دن کا آٹا کم آئے گا-- ویسی--- سبزی--- تھی--- کم ہوتا جائے گا- وہ اتنی چھوٹی عمر میں زندہ رہنے کی تمام چھوٹی موٹی ضرورتوں کو پہچان چکی تھی جس کو ایک عام لڑکی شادی کے بعد بلکہ بہت بعد میں جانتی ہے- وہ گھبراتی نہیں تھی اور وہ مایوس نہیں ہوتی تھی- جب ماں کو کوئی پریشانی پیش آتی تو دلیری سے کہتی، 'ماں! تم کیوں گھبراتی ہو--- ماشااللہ ہم کما سکتی ہیں--- ہم جوان ہو گئی ہیں--- ہم صحت مند ہیں----- ہمارے دس ہاتھ ہیں ---- دس ہاتھ، ماں!' وہ زور دیتی---- 'اور بھائی بھی تو جوان ہو جائے گا!!' یہاں پہنچ کر وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ضرور رو دیتی!

پُرامید رضوانہ دفتر پہنچ گئی - منزل اب صرف چند گام ہی رہ گئی تھی اور تھی بھی اُس کی پہنچ میں- اپنی کامیابی کی امید پر وہ خوش ہو رہی تھی- وہ وہاں پہنچ گئی جہاں انٹرویو ہو رہے تھے- اُس کو بہت خوشی ہوئی کہ انٹر گرلز کالج، جہاں اس نے ٹیسٹ دیا تھا وہاں 12، امیدواروں میں سے صرف تین لڑکیوں کو انٹرویو کے لیے بلایا تھا- یہ جان کر رضوانہ کو اپنی کامیابی کے چانس کئی گنا بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے- وہ لسٹ میں تین امیدواروں میں اپنا نام دیکھ کر پھولے نہ سما رہی تھی- انٹرویو شروع ہوئے اس کی ساتھی لڑکی تقریباً پچیس تیس منٹ میں انٹرویو دے کر باہر نکلی - اُس نے بتایا عام سے سوال پوچھے گئے - موجودہ اردو ڈراموں پر بات ہوئی- اُس کے ساتھ سامنے ایک عورت بیٹھی تھی جس کی بیٹی بھی انٹرویو کے لیے آئی تھی- اُس نے اپنی بیٹی کو آواز دی جو کینٹین سے چائے پی کر فریش ہو کر آ رہی تھی- لسٹ میں دوسرا نمبر اُس کا تھا- جب وہ قریب آئی تو رضوانہ اُسے دیکھ کر

حیران رہ گئی۔ وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی لیکن اُس کی دونوں ہاتھوں کی درمیان والی تین تین انگلیاں تھیں ہی نہیں۔ رضوانہ کو ایک جھٹکا لگا۔ رضوانہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد آواز پڑی اور وہ اپنے ڈاکومنٹ پکڑے انٹرویو کے لیے دفتر میں چلی گئی۔ رضوانہ نے اُس عورت سے اُس کی بیٹی کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ اُس عورت نے کہا ''یہ میری بیٹی ہے---- بہت محنتی ہے---- میری تین بیٹیاں ہیں---- یہ سب سے بڑی ہے---- ہمت اور حوصلے والی---- ہمارا مقدر---- افسوس....... پیدائش سے ہی اس کی دونوں ہاتھوں کی تین تین انگلیاں ایسے ہی اُدھوری ہیں---- شکر ہے اُس مالک کا---- ہو کیا سکتا ہے---- پر ہم نے اس کی پرورش بہت محنت اور احتیاط سے کی ہے---- اِسے اعتماد دیا ہے---- اِسے کبھی کمتری کا احساس نہیں ہونے دیا---- اور یہ ہے بھی اتنی اچھی کہ اپنی معذوری کو اس نے کبھی معذوری سمجھا ہی نہیں----!!'' لوگوں کے درمیان اپنے آپ کو نامکمل محسوس ہی نہیں کرتی---- عجیب لڑکی ہے کہتی ہے شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھ چار انگلیاں ہی دے دی ہیں جو خدا چھ انگلیاں لے سکتا ہے وہ کیا دوسری چار نہیں لے سکتا تھا۔ آخر اِن انگلیوں میں فاصلہ ہی کتنا ہے! ہم حیران ہو جاتے ہیں اِس کی سوچ پر۔ آئی ایم پراوڈ آف مائی ڈاٹر لیکن تم اس کی لکھائی دیکھو تو حیران ہو جاؤ...... انگوٹھے اور چھوٹی انگلی سے پکڑ کر قلم سے کیا خوبصورت لکھتی ہے---

سبحان اللہ۔ لکھائی اور پڑھائی میں اپنی چھوٹی بہنوں سے بہت آگے ہے!!'' اُس کی آنکھوں میں اُداسی اور خوشی دونوں کی چمک اُتر آئی تھی۔ اِن دونوں کی باتوں باتوں میں ہی اُس لڑکی کا انٹرویو ختم ہو گیا۔ دفتر کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئی۔ اسناد کو سمیٹتی ہوئی آگے بڑھی اُس کی باتوں میں تھوڑی سی بدحواسی اور عجلت تھی۔ اُس لڑکی کی ماں دوڑ کر اپنی بیٹی کی طرف لپکی۔ وہ بولی---- ''ہاں ماں! انٹرویو بہت اچھا ہو گیا ہے---- آسان سوال تھے!!''

جب وہ ماں بیٹی آپس میں باتیں کر رہی تھی، رضوانہ نے اپنی اسناد والا پلاسٹک کا مختلف پرتوں والا بیگ اٹھایا اور انٹرویو آفس سے واپسی کے لئے مین گیٹ کی طرف چل پڑی۔ جب وہ بجری سے بنی سڑک پر گھر کی طرف جا رہی تھی تو دفتر کے باہر نائب قاصد انٹرویو کے لیے اس آخری امیدوار، رضوانہ بی بی کو آوازیں دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

داستاں در داستاں

اللہ رب العزت نے فرشتوں کو جمع کیا اور سے فرمایا: ''میں آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں''۔

''مگر وہ زمین میں فساد پیدا کرے گا'' .....فرشتوں نے عرض گزاری۔ جواب ملا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ کرۂ ارض کروڑوں برس قدیم ہے۔ اجماع یہ ہے کہ انسانی سفر لاکھوں برسوں پر محیط ہے اور مگر میسر انسانی کہانی بہت طویل نہیں۔ جو ہے وہ بھی ٹکڑے جوڑ جوڑ کر جمع کی گئی ہے۔ بات چند ہزار سالوں تک محدود رہتی ہے۔ تصویر بھدی ہے اور واضح نہیں۔ حقائق پر گرد و غبار کی اَن گنت نادیدہ تہیں جمی ہیں۔

مروج کیلنڈر کا آغاز مسیحؑ کی ولادت سے ہوتا ہے۔ ہندی کیلنڈر بکر ماجیت تھوڑا پرانا ہے۔ دونوں کے آغاز کے دنوں میں ایودھیا میں راجا دشرتھ ہوا کرتا تھا۔ اُس نے کیکئی نامی عورت کو دیکھا تو دل و جان سے اُس پر لٹو ہو گیا۔

''کیکئی' میں تم سے بیاہ رچانا چاہتا ہوں''۔

کیکئی ذرا شرمائی پھر بولی: ''تین شرطیں ماننا پڑیں گی۔ مان لو گے تو تمھاری''۔

''بولو بولو''۔

''پہلی شرط یہ کہ تمھارے بعد میری کوکھ سے جنمے بیٹے کو حق حکمرانی ملے گا''۔

''تمھاری اِچھا ہے تو ایسا ہی ہوگا''.....راجا نے کہا۔

''رام کو چودہ سال کا بن باس ملے گا''.....کیکئی نے کہا تو راجا نے مشاورت کے لیے دائیں بائیں دیکھا مگر کوئی وزیر باتدبیر پاس نہ تھا۔ راجا دَشرتھ نے ایک نظر کیکئی پر ڈالی۔ حسن بے مثال تھا۔ پھر بے چارگی سے بولا ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے''۔

سیانی کیکئی نے دوسری شرط شاید اس لیے لگائی تھی کہ اُس کی کوکھ سے جنمے بیٹے کو حکمرانی میں کوئی اَڑچن نہ آئے اور وہ اطمینان سے راجا گیری کرے۔ دَشرتھ نے تیسری شرط کا پوچھا تو کیکئی مسکرائی اور بتایا

اسلام عظمی

کہ درست سمے کے آنے تک دونوں شرائط چھپی رہیں گی۔

جلد ہی تیسری رانی راج محل میں آ گئی۔ لوک داستانوں کا اختتام اس جملے پر ہوتا ہے کہ راجا دلشاد ہوا تو رعایا بھی شاد ہو گئی۔ اور پھر ہر طرف امن و چین کا دور دورہ ہو گیا۔

ولادتِ مسیح سے کوئی دو ہزار سال بعد ملک اُردن کے شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا ولی عہد (Crown Prince) مقرر کیا۔ کئی برس کے بعد شاہ بیمار پڑا تو اُسے سات سمندر پار کے ایک ہسپتال میں بھرتی ہونا پڑا۔ بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے شاہ کے دل میں جانے کیا اور کیوں ایک وسوسہ اُٹھا۔ وسوسہ ایسا تھا کہ وہ اپنی بیماری بھول گیا۔ کسی مدد کے بغیر اچھل کر بستر سے اُٹھا اور پاؤں زمین پر ٹکا کر بیٹھ گیا ''میں وطن یاترا چاہتا ہوں''۔

نرس کچھ نروس ہوئی۔ پھر سنبھلی۔ اپنی انتظامیہ کو خبر کی۔ سفر میں دشواری نہ تھی کہ ہوائی جہاز ذاتی تھا۔ جہاز میں بیٹھا اور اپنے دارلحکومت عمان میں جا اُترا۔ جہاز کی سیڑھیوں سے اتر کر جھکا اور سجدے میں جا کر دھرتی کا بوسہ لیا۔

چند گھنٹے شاہی محل میں گزارنے کے بعد اور فرمان جاری کیا ''پرانے ولی عہد کو معطل کیا جاتا ہے اور نئی بیوی سے پیدا ہونے والا سپوت ولی عہد ہوگا''۔

رموزِ خسرواں خسرواں داند۔ ایسی باتیں عام لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں۔ سننے والوں نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

شاہ دو ایک روز بعد پھر ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا۔ اور پھر ہسپتال کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ موت کے فرشتے نے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر تاریخ اور دن دیکھا۔ اپنی گھڑی پر نظریں جمائیں اور وقتِ متعین پر شاہ کی روح قبض کی اور یہ جا وہ جا۔ خلقت نے حیرانی کی۔ کسی کو بھی ایسا نہیں لگا کہ شاہ کو مخصوص دنوں تک زندہ رہنے کا انجکشن دیا گیا۔

سائیں تھلے تک یہ بات پہنچی تو وہ بڑبڑایا ''سب اُوپر والے کی مرضی سے ہوتا ہے''۔

اس دنیا میں ہر کوئی اپنے ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ ہر کسی کا اپنا اپنا خواب ہے۔ پاکستانی پاسپورٹ کا رنگ سبز ہے اور لوگ سبز کارڈ کے خواب دیکھتے ہیں۔ عورت یا مرد، بچہ یا بوڑھا، ڈاڑھی والا یا بغیر ڈاڑھی والا، خواب سب کا ایک جیسا ہے۔ ڈاڑھی والے سے پوچھو کہ تمھارا خواب ایسا کیوں تو جواب ملتا ہے کہ شرق کیا اور غرب کیا۔ زمین خدا کی ہے۔ امریکا جاؤں گا۔ ڈالر کماؤں گا۔ سب کو دکھاؤں گا۔

سات سمندر پار پہنچنے میں اڑچنیں مگر بہت ہیں۔ ہوائی جہاز کا کرایا بھی بڑھ گیا ہے۔ اُس لڑکی کا نام تو کچھ اور تھا مگر سب اُسے پگلی کہتے تھے۔ خواب اُس کا بھی سات سمندر پار جانے

کا تھا۔ اُکیلی لڑکی کے لیے سات سمندر پار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہاں ایک اُدھ سمندر پار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اُس کی لاٹری لگ سکتی تھی۔ جہاں خواب دیکھنے والے ہوتے ہیں، وہاں خواب بیچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ کسی وچولے نے خبر دی کہ آدھ سمندر پار ایک جوہری اُس کا منتظر ہے۔ پارس صفت ہے جسے چھو لے وہ سونا بن جائے۔ سونا بھی خالص۔ پورا چوبیس قیراط۔ کھوٹ سے پاک۔ کھوٹ سے سونا چاندی تو پاک ہو سکتے ہیں مگر بندے نہیں۔ بہت پیچیدہ مشین ہے۔ دوسرے بندے کے دل میں کیا ہے! یہ بات کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ ہنس کر بات کرنے والے کے دل میں کیا ہے، دیکھنے والا نہیں جان سکتا۔ بندہ جانے یا بندے کا خدا۔ پنگی نئے دیس میں پہنچی تو وہاں کی رنگینیاں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں طوطے ہوتے تو پھر سے اڑ جاتے۔ پنگی کی نانی کہا کرتی تھی۔ طوطیا من موتیا اوس گلی نہ جا' اوس گلی دے جٹ بُرے اوہ لیندے پھندا پا۔ وقت نے لوگوں کی مت مار دی تھی کہ خود پنجابیوں کو پنجابی محاورے بھول چکے تھے۔ پنجابی تو در کنار اردو والے بھی روتے پھرتے تھے۔ زمانہ نیا تھا مگر دستور پرانا۔ ''نیا قانون'' لکھنے والا منٹو منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا۔ پنگی کو نئے دیس میں پہنچ کر ایسا لگا کہ وہ جہنم سے نکل کر جنت میں پہنچ گئی ہے۔ جنت کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ پنگی کا شوہر دو (۲) نوکریاں کرتا تھا۔ ساڑھے چھ بجے صبح گھر سے نکلتا اور رات کے دس بجے واپس گھر آتا۔ گاڑی اور ڈرائیور پنگی کی دسترس میں رہتے۔ وہ سارا دن گھومتی رہتی۔ مزے اُڑاتی۔

پردیس میں ٹائم پاس کرنا ایک ہنر ہے۔ بات سننے کے لیے کوئی پاس نہ ہو تو پیٹ پھولنے لگتا ہے۔ پنگی کا اپنے جیسی اور اپنی بولی بولنے والوں سے رابطہ بڑھنے لگا۔ میل ملاقاتوں میں ٹائم پاس کے لیے چغل خوری مناسب ہتھیار ہے۔ برسوں پہلے شاعر مہدی علی خان نے کہا تھا کہ...... کتا بھی ساتھ رکھتی ہے شوہر کے باوجود۔ کتا ایک نجس جانور ہے۔ گنہگار بندے مل جائیں تو کیا کیوں پالنا! رنگ رنگ کے میل ملاپ میں ہی پنگی کے کان میں بھنک پڑی کہ وہ اپنے شوہر کی چوتھی بیوی ہے۔ یہ سن کے اُسے غش نہیں آیا کیونکہ وہ وہاں آنے سے پہلے ہی جانتی تھی کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ وہ کشتیاں جلاتے ہوئے یہاں پہنچی تھی۔ پھر بھی وہ جان نہ پائی کہ اس کے شوہر کی نظر ایک اور حسینہ پر لگی ہوئی ہے۔

جب اُسے یہ خبر ملی کہ وہ کچھ بیویوں کا بوجھ اتارنا چاہتا اور فالتو بیویوں سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے تو پنگی خوشی سے ناچ ناچ کر ہلکان ہو گئی کہ اب وہ پوری طرح راج کرے گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ زمانہ راجاؤں کے زمانے سے آگے نکل آیا ہے۔ یاد آیا کہ کہانی

کے آغاز میں شیطان کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ یہ سہو تھا۔ شیطان کا تذکرہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ شیطان ریٹائر ہو چکا ہے اور وہ اب انسانوں کو گمراہ نہیں کرتا۔ اُسے انسانوں کو گمراہ کرنے کھلی چھٹی ہے۔ جہاں کسی کا قدم ڈگمگایا..... شیطان دوڑا آیا اور پوچھا ''میرے لائق کوئی خدمت!''

جب شیطان نے یہ دیکھا کہ دونوں اپنے اپنے فوائد کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو اُس نے دونوں کو الگ الگ ہلا شیری دی۔ نیک کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے' اُس کا مشورہ تھا۔ اُس نے سمجھایا کہ ایک شاعر ہوا کرتا تھا عبدالحمید عدم..... اُس نے کہا تھا۔

جو بھی کرنا ہے کر گزر اے دل
سوچنا مرگِ شادمانی ہے

.....

پگلی اور اُس کا شوہر دونوں جلدی میں تھے۔ فٹا فٹ اس کی باتوں میں آ گئے۔ خوشی بھی ثابت ماش کی طرح کسی کو راس اور کسی کو بادی۔ قدرت کو پگلی کی خوشی راس نہ آئی۔ خوشی کا معاملہ بھی عجب ہے۔ وہ آتی ہے مگر ساتھ دکھ کی پخ لگا کر۔ دکھ کے بارے میں جھلی نے اس لیے نہیں سوچا کہ وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ گورے رنگ کا زمانہ کبھی ہوتا نہیں پرانا۔

پگلی کا رنگ گورا تھا اور بے عیب بھی۔ یہیں آ کر اُسے پتا چلا کہ گورے اور گوریاں ایسے ہی گورے مشہور ہو گئے ہیں۔ چہرے داغدار ہوتے ہیں۔ پگلی نے رامائن کا نام نہیں سُنا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیکئی نامی عورت نے کس سلیقے سے دو شرطیں منوالی تھیں۔ مگر یہ بات پرانے زمانے کی تھی۔ آج کا دور ہوتا تو وہ شرطیں رکھنے سے پہلے ایک سو ایک مرتبہ سوچتی۔ اب معاملہ طلب اور رسد پر آ چکا تھا۔ طلب سے رسد بڑھ جائے تو قیمتیں گر جاتی ہے۔ پگلی بے چاری سٹار پلس قسم کے اسلامی ڈرامے ہی دیکھتی آئی تھی۔ وہ نسوانی چالوں سے تو واقف تھی مگر مردانہ عیاریوں سے نہیں۔ شہر نیا تھا دستور نیا تھا۔ لوگ نئے تھے روگ نئے تھے۔ ہولے ہولے اُسے نئے شہر کے رسم و رواج سے آگاہی ہونے لگی۔ اُس کی ایک سہیلی نے بتایا کہ جلد ہی اُس کا خاوند نئی شادی بنانے والا ہے۔ وہ اپنی ساری سہیلیوں کو اُس تقریب میں مدعو کرے گی۔ پگلی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا..... ''تمھارا شوہر اور شادی کرے گا اور تم شادی کی تقریب میں خوشی سے سہیلیوں سمیت شرکت کرو گی!''

''بالکل۔ بالکل''۔

''تم اپنے حواس میں تو ہو''۔

''بالکل ہوں''..... ''وہ شادی کر رہا ہے تو مجھے کیا؟ وہ اُسے الگ گھر لے کر دے گا۔ ایک رات اُس کے ساتھ گزارے گا اور اگلی رات میرے پاس۔ ایک رات وہ اکیلی رہے گی اور اگلی رات میں اکیلی رہوں گی۔ سمجھی پگلی!''..... یہ بتا کر وہ ہنس دی۔ پگلی حیرانی سے اُس کا مُنہ تکتی رہ گئی۔

☆☆☆☆☆

خمارِ بے کار [مختصر افسانہ]

عاصم بخاری

مخمور والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں باپ نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے آوارہ مزاج تھا۔ یہ شعر اس پر فائق آتا تھا۔

آغازِ جوانی ہے ذرا جھوم کے چلتے ہیں
دنیا یہ سمجھتی ہے کچھ پی کے نکلتے ہیں

نوجوانی کا نشہ اور خمار تھا۔ آوارہ مزاجوں سے دوستی ہو گئی۔ اس کا باپ بڑا افسر تھا۔ جس کی وجہ سے گھر میں خاصی خوش حالی تھی۔ جس کی وجہ سے یہ نشہ باز دوستوں کے نشانے پر تھا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اسے سگریٹ سے شروع کر کے چرس افیون ہیروئن اور جدید نشوں آئس شیشہ وغیرہ پر لگا کے اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

ماں اس کے سرخ سفید خوب صورت گلاب کے جیسے چہرے کو پھول کی طرح کملاتا اور مرجھاتا دیکھ کر متفکر اور پریشان رہتی تھی۔ چہرے پر زردی نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ چہرے پر ابھی تھوڑی تھوڑی مونچھیں نمودار ہو رہی تھیں۔ ماں کے جی میں آیا کہ بیٹے کی شادی کر دی جائے۔ مخمور

کے باپ سے ڈرتے ہوئے مشورہ کیا کہ شاید اس طرح بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس کے باپ نے بادلِ ناخواستہ کہا دیکھ لو مجھے تو نہیں لگتا۔ ماں جیت گئی۔ بالآخر مخمور کی شادی خانہ آبادی ہوگئی۔ باپ نے ملازمت کا کہا تو مخمور نے کام کاج سے صاف انکار کر دیا۔ بے کار پڑا رہتا۔ یا پھر جب جی میں آتا نشہ باز دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے چلا جاتا۔ سال بعد اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹی یعنی اپنی رحمت سے نوازا۔

دریں اثنا مخمور کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ انتقال کر گیا۔ گھر کا ماحول یکسر بدل گیا خوش بختی نے یکسر بدحالی کا روپ دھارا۔ مخمور کی بیوی بھی اداس اداس نظر آنے لگی۔ مخمور کی ماں نے پینشن کی رقم سے پوتی کے لیے سونے کی بالیاں بنوا کے اس کو پہنائیں۔ کچھ عرصہ بعد مخمور کی ماں کو فالج کا اٹیک ہوا اور وہ معذور ہوگئی۔ ادھر نوبت فاقوں پہ آگئی۔ ادھر مخمور کے نشہ کی لت بھی اپنی انتہاؤں کو چھونے لگی۔ اسے سب دوست چھوڑ گئے۔ نشہ خریدنے کو اب اس کے پاس اب کچھ نہ رہا۔ ماں بھی بالآخر مر گئی۔ اب گھر میں صرف مخمور اس کی بدنصیب بیوی اور ایک دو سال کی معصوم بچی رہ گئے۔ ایک دن آوارہ گردی کر کے مخمور دیر سے گھر پہنچا تو بیٹی بھاگ کر اپنے باپ کی طرف بڑھی۔ باپ نے اسے اٹھالیا بیٹی گلے سے لپٹ کر باپ کے رخسار چومنے لگی کہ اچانک باپ کی نظر اس کے کانوں کی بالیوں پر پڑی۔ اس کی نیت میں فتور آیا۔ بیٹی کو گھر سے باہر لے گیا بیٹی خوش ہوئی کہ ابو باہر گھمانے پھرانے لے جارہے ہیں۔ وہ فرطِ جذبات سے حسبِ معمول باپ کو چومتی اور پیار کرتی جارہی تھی کہ اچانک وہ اسے گھر سے دور ایک ویران مکان میں لے گیا اور اس کے کانوں سے بالیاں نوچ کر غائب ہوگیا۔ بچی روتی چلاتی مشکل سے گھر پہنچی ماں نے کیا دیکھا کہ بیٹی کے کانوں سے خون بہے جارہا تھا۔ سفید لباس سرخ ہوگیا تھا۔ ماں نے حیران ہوکر پوچھا یہ کیا ـــــ

یہ کس نے ظلم ڈھایا

بچی نے روتے سسکتے ہوئے کہا ـــ اب ـــ ابو ـــ

ابو ـــــ نے

☆☆☆☆☆

مٹی کا قرض

اس دھرتی کی ہر شے پر ہے اس مٹی کا قرض
میرے لئے ہے فرض سے پہلے اس مٹی کا قرض

کیوں نہ دھرتی سیوا کر کے خون پسینہ بوئیں
ممکن ہے کچھ کم ہو جائے اس مٹی کا قرض

اک مدت سے دیکھ رہی ہیں میری بھیگی آنکھیں
بڑھ جاتا ہے جب مینہ برسے اس مٹی کا قرض

پیا ملن کو مانگ رہی ہے دھرتی ہار سنگھار
کم کر دیں گے سبز دوشالے اس مٹی کا قرض

میرے لئے جب بار امانت ہے شانوں پر سر
سر سے میرے کیسے اترے اس مٹی کا قرض

ارضِ وطن سے پوچھو ہم سب ہیں کب سے مقروض
پنجند نے تو اب مانگا ہے اس مٹی کا قرض

جہلِ خرد کے اندھیاروں میں گھٹ تو سکتا ہے
پلکوں پہ جلد یپ سجا کے اس مٹی کا قرض

قوم کو گروی رکھنے والو، خوب چکایا ہے
مٹی کا کشکول بنا کے اس مٹی کا قرض

روز و شب مقروض ہیں میرے، سانسیں تک مقروض
مجھ کو تو ورثے میں ملا ہے اس مٹی کا قرض

جیتے جی ہے اس مٹی کا قرض چکانا مشکل
بڑھ جائے گا قبر میں جا کے اس مٹی کا قرض

سید فخر الدین بلے

زخم ایسا ہے بے وفائی کا

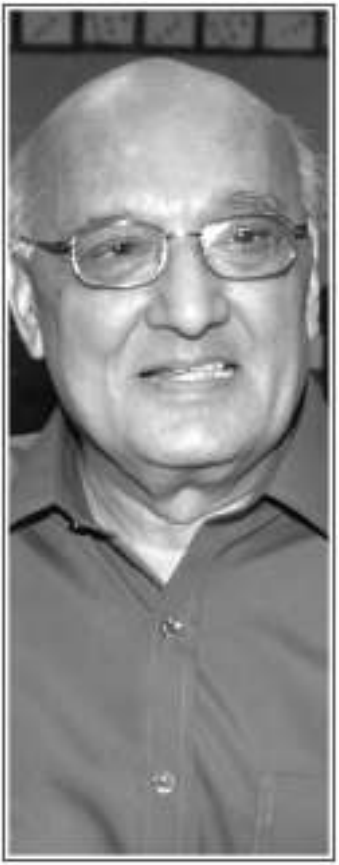

یاد کچھ دیر تک ہی رہتے ہیں
آپ کی زندگی کو مشکل میں
ڈالنے یا نکالنے والے!

پر کوئی شخص جس نے ایسے میں
مان توڑا ہو، ساتھ چھوڑا ہو
وہ کسی طور بھولتا ہی نہیں

وقت کی گردشوں کے طوفاں میں
یوں تو دنیا میں کیا نہیں ہوتا
پر گزرتا نہیں وہ اک لمحہ
دھیان کے آئنے سے اُس کا عکس
مرتے دم تک جدا نہیں ہوتا

امجد اسلام امجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات لبوں پر کیا کیا برسا ابر تری مہمانی کا
پیاس کا جھولا جھول رہا تھا ایک کٹورا پانی کا

اپنی ''مانا'' کے لیے [شادی کی پچاسویں سالگرہ پر]

"جبیں" جس روز سے "مانا" ہوئی ہے
وہ میرا دل مری دنیا ہوئی ہے

نئے زمل نقوش اُس نے نکالے
"حسینہ" اور دل آرا ہوئی ہے

ہوئی وہ ہمقدم تو زندگانی
کھری خوشیوں بھرا رستہ ہوئی ہے

سفر آگے بڑھا جوں جوں تو چاہت
درختوں کا گھنا سایا ہوئی ہے

میں اُس کے واسطے کچھ سے ہوا کچھ
مری خاطر وہ کیا سے کیا ہوئی ہے

میں، اس نے جس طرح چاہا ہوا ہوں
وہ، میں نے جس طرح سوچا ہوئی ہے

کُھلے اک دوسرے سے دل تو ہم پر
کہانی دہر کی افشا ہوئی ہے

سلیقے سے سنبھالا ہے گھر اُس نے
قرینے سے عمل پیرا ہوئی ہے

کرشمہ ہے سب اُس کی ہمدمی کا
رفاقت جس قدر اعلا ہوئی ہے

سنبھالی لمبے کومے میں مری ماں
وہ یوں ایثار میں یکتا ہوئی ہے

مرے بچے بھی خوش قسمت ہیں کتنے
نصیب ایسی انہیں ماما ہوئی ہے

مرے اللہ کے فضل و کرم سے
گرہستی خُلد کا نقشہ ہوئی ہے

کمی چھوڑی نہیں قدرت نے کوئی
سپھل اپنی ہر اک اچھا ہوئی ہے

خوشی کا وقت اِس تیزی سے گزرا
صدی آدھی بھی اک لمحہ ہوئی ہے

جلیل عالی

من آنم

نسیمِ سحر

عہدِ جاہلیت میں

مَیں یہی سمجھتا تھا

جانتا ہوں مَیں سب کچھ!

☆

اب جو کچھ شعور آیا

اب یہ جانتا ہوں مَیں

اب یہ مانتا ہوں مَیں

مَیں ہوں جاہلِ مُطلَق

جانتا نہیں کچھ بھی!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، چشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

بستی نجام الدینؒ [ایک تاثر]

ناصر علی سیّد

عجب گہری خموشی ہے
مگر اِک شور و ہنگامے کا اس کے پاس ہی
دریا بھی بہتا ہے
عجب گہری اُداسی ہے
مگر پہلو میں اِس کے خوشبوؤں، رنگوں کی
اور سرشاریوں، سرمستیوں کی حکمرانی ہے
عجب اِک رونقِ بازار ہے
ہنگامہ ہے ..... ہنگامہ بھی ایسا
کہ اپنی بات بھی اپنی سماعت کے حوالے کرنے کو
ہر اِک ترستا ہے

بہت پُرشور اِس بستی کے بیچوں بیچ
اِک ایسی عمارت ہے
جہاں ..... گہری خموشی ہے
جہاں..... گہری اُداسی ہے
جہاں..... افسردگی
سر اپنا شانوں پر ہوا کے رکھ کے
کچھ بیتے زمانے یاد کرتی ہے
مجھے بے حال کرتی ہے
بہت برباد کرتی ہے

(مزارِ غالبؔ)

خوشبو بکھر گئی [پروین شاکر کی نذر]

گلزار بخاری

آغاز و انتہا کی حکایت عجیب ہے
ہاتھوں نے تخم اس کا دبایا زمین میں
پانی سے خاک اس کے لیے نرم کی گئی
چپکے سے ایک نرم سے پودے نے پھوٹ کر
کاوش نے سلسلے کو بڑھاوا عطا کیا
کونپل سے شاخِ سبز نمودار دیکھنا
دیتا ہے کتنی سرخوشی قلب و نگاہ کو
پائی بطونِ گل میں بہت دیر پرورش
ٹہنی پہ پھول جیسے کسی سر پہ تاج ہو
پروان کس طرح سے چڑھایا گیا اسے
جانے اسے نظر لگی کس بدگمان کی
اک سانحہ گزر گیا طوفان کی طرح
مانا مہک وجود کی بچھڑی گلاب سے
لیکن دل و دماغ کو شاداب کر گئی
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سُراغ تھا
معلوم ہو رہا تھا کہ خوشبو بکھر گئی

تشکر

بہت ممنون ہوں اُن کا
جنھوں نے درد بانٹا ہے
دِلاسے، پیار کے، ہمت، تسلی کے
جنھوں نے پھول بھیجے ہیں
مری دلجوئی کی خاطر جو آئے وہ
ہمیشہ سُرخرو ٹھہریں
دعا کے رنگ میں لپٹے یہ گُلدستے
سجائے ہیں دل و جاں میں
محبت کی چھما چھم کرنے والوں کو
معالج کو، خدایا شاد ماں رکھنا
مُصلّوں پر جو سجدہ ریز تھے ان کو
محبت آشنا کرنا
خُداوندا! عطا کا دَر کھلے تو وہ
جنھوں نے درد بانٹا ہے
بصَد شفقت اُنھیں بھی یاد رکھنا
ان کے ناموں سے کرم کی اِبتدا کرنا

تابش کمال

تخیّل سے یہ کہنا ہے

تخیّل سے یہ کہنا ہے
رہے اپنی سمائی میں
زیادہ پھیلنے کی کیا ضرورت ہے
ہمارے ساتھ یوں ہی باتیں کرتا ہے
شبِ تنہائی کے خاموش لمحوں میں
بگولوں کی طرح اُڑتا ہے خود بھی اور ہم کو بھی اُڑاتا ہے
تھکن سے چور منڈیروں کی شطرنجی بناوٹ میں
ٹکا کر پاؤں حیرت سے گلی میں جھانکتا ہے
اور سبک رفتار ہے ایسا
کواڑوں اور دریچوں سے نکل کر بھاگتا ہے
بھولی بسری گلیوں کے سنسان رستوں پر
دکھاتا ہے کوئی صورت
جسے مورت کہیں تو اچھا لگتا ہے
جواب پہچان کی دیوار سے گر کر
کہیں نا آشنائی کی اندھیری کوٹھڑی میں
جا پڑی ہے
ادھ کھلی کھڑکی کی درزوں میں
اسی کا لمس نرماہٹ کے معنی نقش کرتا تھا
تخیّل کی اگر ہم گرہیں باندھیں تو مچلتا ہے
بہت اودھم مچاتا ہے
بچا کے آنکھ یک دم سے
نکل جاتا ہے لمبی دوپہر میں چلچلاتی
دھوپ کی چھت پر
گلابی سائے سے ملنے
اسے کوئی تو سمجھائے
قدیمہ در قدیمہ گہرے تہہ خانے میں گم ہوتے ہوئے
ان منظروں کے دکھ امانت ہیں
نہایت رکھ رکھاؤ سے
انھیں پالا ہے اس دل نے
بڑی مشکل سے ان کو ضبط کی مضبوط
گٹھڑی میں چھپایا ہے
نہ جانے کیوں
خس و خاشاک لمحوں پر جمی بھوبل ہٹاتا ہے
ہمیں اب کیوں رُلاتا ہے
تخیّل سے یہ کہنا ہے
رہے اپنی سمائی میں

طالب انصاری

صلہ یہ کیسا دیا ہے تم نے؟

مرے وطن کے عظیم لشکر، میں کیوں نہ کہہ دوں
کہ ہم نے سونپی ہے ذمہ داری وطن کے اندر وطن کے باہر خیال رکھنا ہے سرحدوں کا
کمالِ جرأت سے تم نے اپنی قسم نبھائی نبھا رہے ہو
وطن کے اندر، وطن سے باہر، وطن کی سرحد
تمہارے جذبوں، تمہارے قدموں تمہاری جرأت کی داستاں ہیں
شہید تم ہو، تمہی ہو غازی، گلاب تم ہو
تمہارے جسموں سے جب بھی گرتے ہیں خوں کے قطرے
بدن تمہارے گلاب جیسے، گریں کبھی تو
حسین دھرتی کے ذرے ذرے سلام کرتے ہیں گیت گا کر
جہانِ عظمت میں سر اُٹھا کر، نشانِ حیدر تمہیں عطا کر،
عظیم دھرتی بدن میں اپنے تمہیں سجا کر، تمہاری عظمت، تمہاری شوکت پہ ناز کرتی یہ کہہ رہی ہے
صلہ یہ کیسا دیا ہے تم نے
مری محبت، مرے پسینے، مرے لہو کا

گل بخشالوی

پیکرِ فاطمہ جناح

اُن آنکھوں نے سب دیکھا تھا،
سانس گرہ سے بندھی ہوئی تھی
بدن کی دیواروں میں سیلا پن اترا تھا،
دشمنِ جاں اک روگ بنا تھا،
تند ہوا کھڑکی سے باہر اپنا خیمہ تان چکی تھی
اس لمحے تک شکر خدا کا گلشن میں تتلی گل کو
پہچان چکی تھی،
آس کا پنچھی خواب کی ڈالی پر دانہ چگنے
سے پہلے
پنکھ بکھیرے جھوم رہا تھا
اور اِدھر اک ابر کی صورت ٹھنڈک کا
احساس لیے اک نرم سا سایہ
گھوم رہا تھا
جس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں
جذبوں کے گہرے دریا، دریا میں اتری اک ناؤ کو
جذبوں سے ٹکرانے والے طوفانوں کو،
موجوں کے بیچ اور داؤ کو
سیپ میں پلنے والے موتی، پلک کی
اوٹ میں نور کے جیسی روشن جوتی
سائے کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں!
دیکھ رہی تھیں قائد کی سانسیں تو گرہ سے
بندھی ہوئی تھیں
تن میں ایک مہین دراڑ اُبھر آئی تھی،
ڈھلوانوں کی سمت سفر تھا
قدموں سے چند قوس ہمارا خواب نگر تھا
دیواروں سے در تک جاتے
منزل کو اس گھر تک لاتے
روگ کی صورت بن جاتی ہے
بوجھ بھی دل پر بڑھنے لگا تھا
اک آزار کی صورت جاں میں
دکھ کا چاند اُبھرنے لگا تھا
لیکن قائد گردابوں کی اس یورش میں
پرچم لے کر چل نکلا تھا
اس مشکل کے کڑے سمے میں مرمری
پیکر بجھتے دیے کی

رخشندہ نوید

لو کے آگے آنچل تانے،
قائد کو دن رات بچانے،
کڑے سے کی جلتی دھوپ میں سائے کا
احساس رہا تھا
تن پر مرمری پیکر کے دن رات سفید
لباس رہا تھا،
بہن نہیں تھی وہ قائد کا اک سایہ تھی
دھوپ کی لمبی سڑک
پہ ٹھنڈی سی چھایا تھی،
اُس کی آنکھوں نے سوچا تھا،
بھائی چاند کی کچھ کرنیں پانی میں گھول
کے پی جائے
بھائی خواب کی خاطر اور بھی اور ابھی کچھ
دن جی جائے!
اُس لمحے تک جب پرچم
آکاش کو چھو لے!
اُس دم تک اُس کے
دم میں دم قائم ہو!
اور خواب اپنا بھی دائم ہو!

بارشوں کے موسم میں

بارشوں کے موسم میں
زخم کیوں سلگتے ہیں
شبنمی نگاہوں میں
دکھ جو مسکراتے ہیں
خواب جاگ اٹھتے ہیں
نیند کی پناہوں میں
اجنبی اُداسی ہے
تال پر یوں رم جھم کی
تیری یاد رقصاں ہے
خامشی کی بانہوں میں
جھومتی ہے تنہائی
گل مہکنے لگتے ہیں
میری منتظر آنکھیں
پھر بھٹکنے لگتی ہیں

تیرے شہر کا موسم
مجھ کو پھر بلاتا ہے
یاد کے شبستاں میں
ہجر مسکراتا ہے
دیپ جلنے لگتے ہیں
چھوڑ جانے والے پھر
لوٹ کر نہیں آتے
جانتے ہوئے بھی کیوں
خواہشیں مچلتی ہیں
بارشوں کے موسم میں
زخم کیوں سلگتے ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر مجھ کو چراغوں نے ٹھہرنے نہ دیا
میں وہ لَو تھا جسے سورج نے اُبھرنے نہ دیا

"پہاڑے کا رٹا۔۔۔زندگی"

مشرق سے ابھرتی ہوئی شعاعوں کی نئی خبر
''صبح دم دروازۂ خاور کھلا''
پرانا دن طلوع ہو گیا
فٹ پاتھیا گھسیٹتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا
(جیسے بڑے کام سرانجام دینے ہوں گے)
بوسیدہ دروازے کی بھینگی آنکھ کھلی
کچی آبادیوں کی پکی نیند پہ مکھیاں بھنبھنانے لگی
دیوار مزار سے جڑے ہوئے سائے نے
دیوارِ مزار سے پشت ٹکا کر آسمان کو تکنے
کی ڈیوٹی سنبھال لی
روزی روٹی کا چھابہ لگانے والا
پانی چھڑک کر راہ جمانے لگا
''رات چار بار بجلی گئی تھی''
کٹوری بھر چائے سرک کر بابو نے گالی دی
گیلی مٹی پہ ٹانگیں پسارتے کتے نے جمائی لی
اب
دھوپ کا دیو بلندی سے چھلانگ لگا کر اترا
اور دھرتی کا گلا دبوچنے لگا
الجھے میلے بالوں والی سر کجھاتی ماں بیٹی
کل والے دکھی جملے دہرانے لگیں
کھلے شیشوں والی چھوٹی گاڑی نے بند
شیشوں والی بڑی گاڑی کو
موٹر سائیکل کو ہلا جلا کر سٹارٹ کرنے والے
نے دوڑتی گاڑیوں کو کوسا
سالے کے پاس کتنا پٹرول ہے
پھیکے بے رونق چہرے سارے
''ایسا لگتا ہے بندے منہ نہیں دھوتے
ان کے لبادے بھی ویران ہیں''
درختوں نے باہم سرگوشی کی
مفلوک الحال آوارہ شاعر نے آہ بھری
اب صرف پھول خوش دکھائی دیتے ہیں
اے بدھا۔۔۔ مجھے درخت بنا دے
مفلوک نہ مقروض
نہ ہاتھ نہ ہاتھ کی ریکھائیں
جیب نہ جیب میں مال
ڈاکو مجمع لگائے تبلیغ کرتا تھا
''یہ اصولوں والی کتاب پھینکو
تم نہ مانو گے ہمیں نہ فرق پڑے گا
جیتے مرتے رہو جوں کے توں''
بھوک بستی پہ براجمان رہی
دھوپ آ کے جا بھی چکی
مغرب میں ڈوبتی شفق کا اعلامیہ جاری ہوا
پرانے کے نئے طلوع تک شب بخیر

دردانہ نوشین خان

سالگرہ کا نوحہ

اب برتھ ڈے کا کیک بھی سستا نہیں رہا
خوشیوں کا دوستو کوئی رستا نہیں رہا

گھر والے لسٹ دیتے ہیں خرچے کی ہاتھ میں
بے فائدہ ہم آئے ہیں اس کائنات میں

مہنگائی نے تباہ کیا ہے غریب کو
موقع ملے تو پوچھو کسی بد نصیب کو

مہمان گھر میں آئے نہ اس حال میں کوئی
اس زندگی کو کوئی نہیں کہتا زندگی

چھوٹی سی فیکٹری میں ملازم ہوں آجکل
قسمت پہ اپنی دوستو نادم ہوں آجکل

بجلی کا بل جو آئے لرز جاتا ہے یہ دل
چہرے پہ ایک بھی نہیں باقی بچا ہے تِل

تفریح کے لیے کوئی جاتا نہیں کہیں
جی چاہتا ہے اب تو سما لے ہمیں زمیں

سینے میں پل رہے ہیں مرے بے شمار غم
ایسے میں اپنی سالگرہ کیا منائیں ہم

ملتی نہیں ہے کوئی خوشی کی خبر ہمیں
ہر چیز نے کیا ہوا ہے بے اثر ہمیں

تعلیم بچوں کی بھلا کس طرح حل کریں
جی چاہتا ہے آگ لگے اور جل مریں

اپنا کوئی مکاں نہیں گھر ہے کرائے کا
ہوتا نہیں کسی پہ اثر میری ہائے کا

بچے ترس رہے ہیں کھلونوں کو آجکل
دل کو سکوں نہیں ہے دماغوں میں ہے خلل

کانوں میں اپنے کوئی صدا بھی نہ آئے گی
جب ہم نہ ہوں گے سالگرہ بھی نہ آئے گی

علی حسین عابدی

می رقصم

[حضرت عثمان ہارونی رحمہ اللہ کی مشہور فارسی غزل کا اردو ترجمہ]

نہیں معلوم کیوں آخر؟ دمِ دیدار میں ناچوں
مگر یہ ناز ہے جب روبرو ہو یار، میں ناچوں

تُو ہو جس وقت بھی نغمہ سرا ہر بار میں ناچوں
نچائے تو مجھے جس رنگ میں اے یار! میں ناچوں

تو وہ قاتل کہ میرا خوں بہانا دل لگی تیری
میں وہ بسمل کہ خنجر جتنا ہو خونخوار میں ناچوں

خوشا رندی کہ ہر اک پارسائی ہو فدا تجھ پر!
زہے تقویٰ کہ پہنے جبہ و دستار میں ناچوں

کبھی یوں جان پر ان کھیلنے والوں میں دیکھ آ کے
کیے رسوائی کا ساماں سرِ بازار میں ناچوں

جہاں کانٹے پہ ٹک سکتا نہیں پانی کا قطرہ، میں
وہاں وہ شبنمِ خوں ہوں بہ نوکِ خار، میں ناچوں

میں وہ منصور ہوں عثمان اِس عہدِ ملامت کا
کہ سولی چڑھ کے بھی ہوں اس قدر سرشار، میں ناچوں

مرے احساس کے سازوں پہ میرے نغمہ ہائے غم
پھر اس پر جب مرا مطرب بھی ہو فنکار میں ناچوں

یونہی پگڈنڈیوں پر خارزاروں سے گزرنا ہے
کہ تیز اپنی کروں آصف! جہاں رفتار میں ناچوں

مرزا آصف رسول

مجھے پڑھنا نہیں آتا

فقط کچھ حرف آتے ہیں
فقط کچھ لفظ آتے ہیں
یا کچھ اشعار ازبر ہیں
یا کچھ اشعار کے مطلب
یا کچھ اشخاص کے بارے میں معلومات ازبر ہیں
یا کچھ آیات آتی ہیں
یا اُن آیات کا اِک خام سا مفہوم آتا ہے
انہی محدود اور معدود معلومات کے باعث
زمانے والے مجھ کو صاحبِ ادراک کہتے ہیں
حقیقت پوچھتے ہو تو
حقیقت صرف اتنی ہے
مجھے پڑھنا نہیں آتا
غلط ہی پڑھتا جاتا ہوں
وہ آنکھوں کی اشارت ہو
وہ چہروں کی عبارت ہو
وہ سوچوں کی بجھارت ہو
غلط ہی پڑھتا جاتا ہوں
جو میرے زیرِ سایہ ہیں اسے بھی ٹھیک کہتے ہیں
کہ میرے زیرِ سایہ ہیں
جو مُجھ سے پیار کرتے ہیں
انہیں تو میری کج فہمی پہ بھی بس پیار آتا ہے
حقیقت پوچھتے ہو تو
مجھے پڑھنا نہیں آتا
کبھی لفظِ ضرورت کو محبت پڑھنے لگتا ہوں
محبت کو عموماً میں شرارت پڑھنے لگتا ہوں
کبھی سجدوں کی عادت کو عبادت پڑھنے لگتا ہوں
دکھاوے کی سجاوٹ کو طہارت پڑھنے لگتا ہوں
کبھی تو آزمائش کو بھی نعمت پڑھنے لگتا ہوں
میں بچپن ہی سے پڑھنے میں ذرا کم زور ٹھہرا ہوں
نصیحت کو میں بچپن میں بھی نفرت سمجھا کرتا تھا
مگر اب جب کہ چاندی میرے بالوں سے ہویدا ہے
غلط پڑھتے ہوئے مجھ کو ذرا سی شرم آتی ہے
سو اب جو کچھ بھی پڑھتا ہوں وہ زیرِ لب ہی پڑھتا ہوں
بہت کم بولتا ہوں میں
مری کم گوئی کو حکمت پہ سب مامور کرتے ہیں !
تو گویا اُن کو بھی میری طرح پڑھنا نہیں آتا

عامدار حسین

مگر اِک خوف دامن گیر رہتا ہے سدا مُجھ کو
کہ کوئی صاحبِ اسرار بھی اُن میں اگر ہو تو

.....

مرے مولا ! ۔۔۔۔ مرے مولا!
نہ پڑھ پانے کے باعث کب تلک میں دھوکے کھاؤں گا
مجھے آثار سے سچائیاں معلوم کرنی ہیں
مجھے آیات کی تفسیر کی تہہ میں اترنا ہے
مجھے غاروں میں کھوئی صورتیں دریافت کرنی ہیں
مجھے موجود، لاموجود کی خبریں نہیں دیتا
میں اپنے حال کی تختی پہ لکھی خبرِ آئندہ نہ پڑھ پایا تو کیا ہوگا؟
مجھے اقرا باسمِ ربی کی تفسیر مل جائے
دعائے رب زدنی علما کو تاثیر مل جائے
مری بے نور آنکھوں میں جو پڑھ پانے کا سپنا ہے
اسے بھی باب شہرِ علم سے تعبیر مل جائے
مجھے توقیر مل جائے
مرے مولا!۔۔۔۔ مرے مولا!
مجھے پڑھنا نہیں آتا
مجھے پڑھنا نہیں آتا

☆☆☆☆☆

نظم

سعدیہ بشیر

درد کی سیپیوں میں ستارے نئے
ہم نے کاغذ پہ رستے
اتارے نئے
خواب ردی میں بیچے پرانے سبھی
خوش گمانی کے پردے سنوارے نئے
در کی چوکھٹ پہ ملبہ تھا دیوار کا
چارہ گر ڈھونڈتا تھا شرارے نئے
بات آزردگی سے نہ باہر گئی
معتقد سب وہی اور خسارے نئے
اختتامِ دعا پہ سفر کی طلب
تھا پرانا بھنور اور دھارے نئے
ہجر کے سارے معنی وہی اب تلک
وصل کے پیرہن اور چارے نئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گل سے یا گلستاں سے ملتا ہے
رنگ کو نم کہاں سے ملتا ہے

وہ اک سراپا

عجیب سا چال میں ردھم ہے
وہ جب چلے تو لگے کہ جیسے ہے نظم کوئی
اگر وہ بیٹھے؟
نظر تو کیا دل میں بیٹھ جائے
وہ اپنی پلکیں اگر اٹھائے
تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی غزل سنائے
وہ اِک سراپا جو خود غزل ہے

وہ جس کے ہونٹوں سے شاعروں نے
تمام بحروں کے فن کو سمجھا
ہے لمس جس کا بھی گویا آبِ حیات جیسا
عطا ہو جس کو
ہر ایک رنج والم سے اِک دم نجات پائے

وہی سراپا
کہ جس کے ابرو کی تیز دھاروں سے
نوعِ انساں نے پہلا خنجر بنایا ہوگا

اسی سراپا کی یہ عطا ہے
کہ جس کی گردن کے زاویوں سے ہی فیض پا کر
کسی پریشان کوزہ گر نے یہ خواب دیکھا؛
صراحی کیسے بنائی جائے
تھکے مسافر کی پیاس کیسے بجھائی جائے

اسی سراپا کے زیر و بم سے ہی
واٹسن اور کرک بھی آخر
یہ جان پائے کہ ڈی این اے میں اتار
کیوں ہیں چڑھاؤ کیوں ہیں
.....کہاں تلک ہیں
وہ کچے دھاگے کی دونوں لڑیاں
جو ایک دوجے کو روزِ اول سے جانتی ہیں
اور اس حقیقت کو مانتی ہیں
کہ ایک دوجے کے ساتھ ہونے میں زندگی ہے۔

وہی سراپا
کہ جس کو دیکھا تو میں نے جانا؛
خدائے برتر نے کن سے سب کچھ بنا دیا تھا
مگر اسے جب بنانا چاہا
تو کینوس پر جمال اپنا بچھا دیا تھا
تمام جھیلیں بنا بنا کے ہی پھینک دیں تھیں
یہ اس کی آنکھوں کا رفِ عمل تھا
یہ ارتقاء تھا

خدائے برتر نے اپنا شہکار جب بنایا
تو یوں بنایا
کہ جو بھی دیکھے
تو وحدہٗ لاشریک خالق کا حسن کیسا ہے؟
جان پائے
بلا تامل خدا مصور ہے، مان جائے

صغیر احمد صغیر

میرا لاہور

بے وفا دنیا میں اپنا آشنا لاہور ہے
میری امیدوں کا مرکز، حوصلہ لاہور ہے

جو بھی آتا ہے یہاں وہ لوٹ کر جاتا نہیں
چاہتوں کا ایک دل کش سلسلہ لاہور ہے

دن کے ہنگاموں میں بھی کب چین پڑتا ہے اسے
اور راتوں کو بھی جیتا جاگتا لاہور ہے

کیا حدود اربع بتائیں ہم تمہیں لاہور کا
شہر کے چاروں طرف پھیلا ہوا لاہور ہے

عشق ہیں دو ہی ہمارے صاف کہتے ہیں تمہیں
ایک تم ہو جانِ جاں اور دوسرا لاہور ہے

دوستو یہ شہر اپنے پاؤں کی زنجیر ہے
ہم جہاں جائیں ہمارا مسئلہ لاہور ہے

جس نے دیکھا ہی نہیں لاہور کیا دیکھا ہے پھر
کیا بتاؤں اس کو میں کیسا مرا لاہور ہے

سرزمینِ اولیاء ہے صوفیوں کا دیس ہے
اور رندوں مے کشوں کا مے کدہ لاہور ہے

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ہم غریبوں بے کسوں کا آسرا لاہور ہے

علم کا مرکز ہے اور پھر کالجوں کا شہر ہے
آندھیوں میں ہے جو روشن وہ دیا لاہور ہے

اس میں کیا شک ہے کہ یہ تو دل ہے پاکستان کا
خون کی ترسیل کا اک سلسلہ لاہور ہے

ہم ہیں لاہوری، مظفر جانتے ہیں ہم کو سب
مستقل یا عارضی اپنا پتا لاہور ہے

مظفر حسن بلوچ

تخلیق

زعیم رشید

ہَوا کو جانے یہ کیا ہوا ہے؟

وہ سر سے پاؤں تک آج کس

سبز کپکپاہٹ میں مبتلا ہے

وہ یوں درختوں میں چھپ رہی ہے

کہ جیسے.....

تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہو

ہَوا کی سانسیں اکھڑ کے پھر سے

سنبھل رہی ہیں

ہَوا کا لہجہ بدل رہا ہے

وجودِ کیف و سرور اُس کا

عجیب مستی کے ساتھ مجھ سے گزر رہا ہے

ہَوا پہ مصرعہ اتر رہا ہے!!!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثنا گر وضو کریں

انقلابی

میں اپنے سر پہ
روایتوں کی عذاب گٹھڑی
اٹھا اٹھا کے بھٹک رہی ہوں
سماج میرا حسین جیون بتا رہا ہے
مرے وجود اور مرے عمل پہ
ہزار آنکھیں گڑی ہوئی ہیں
مری نظر میں ہیں جتنے منظر
حسین رنگوں سے مہکے منظر
وہ سارے منظر ہٹا دیئے ہیں
زمانے والوں نے میری آنکھوں میں
اپنی مرضی کے سارے منظر سجا دیئے ہیں
میں ان کی مرضی سے جی رہی ہوں
میں ان کی منشا سے سوچتی ہوں
میں اپنے ہاتھوں سے اپنی خواہش کے بیل بوٹوں کو
خود ہی پامال کر رہی ہوں
جو میرے اپنے ہیں میری ہستی میں
اپنا جیون بتا رہے ہیں
وجود میرا ہے پر یہ جیون مرا نہیں ہے
یہ میری ہستی
ہزار رنگوں
ہزار طرزوں کی خوشبوؤں سے گندھی یہ
ہستی
معاشرے کی سڑاند بدبو میں
گھل رہی ہے
میں میں نہیں ہوں
میں اپنے چہرے کو خود ہی پہچانتی نہیں ہوں
میں انقلابی ہوں وہ کہ جس نے
بریدہ ہاتھوں
تراز و آنکھوں
شوریدہ سوچوں سے
بس کچھ اتنا نیا کیا ہے
اندھیر نگری میں رہنے والی
سنہری رنگین تتلیوں کو
سحر کا مژدہ سنا دیا ہے
کہ اپنی بیٹی کو
جرأتوں اور شجاعتوں کا
اک استعارہ بنا دیا ہے
اور اس کے نرم و توانا ہاتھوں میں
سات رنگوں کی روشنی کا
حسین پرچم تھما دیا ہے

ریحانہ شبیر

عشق جواری

اعجاز رضوی

ہاری ہوئی محبت
اور جیتی ہوئی رقم
ہمیشہ یاد رہتی ہے
رقم جب تک خرچ نہیں ہو جاتی
اُسے بار بار گننا اچھا لگتا ہے
ہاری ہوئی محبت
جب تک ہارنے والے کو
راکھ نہیں کر دیتی
اُسے گھورتی رہتی ہے
پھر رفتہ رفتہ
برف پوش پہاڑ
رم جھم گھٹا
کھلتے ہوئے پھول
بہتے ہوئے دریا
اور پھیلے ہوئے راستے کو ہمیشہ کے لیے
دھندلا دیتی ہے
پھر ہر صبح ایک سورج نکلتا ہے
اور ہر رات ایک چاند
پھر دونوں
پکار پکار کر کہتے ہیں
اعجاز رضوی
ہاری ہوئی محبت
اور جیتی ہوئی رقم
ہمیشہ یاد رہتی ہے

خطوط

نسیم سحر

برادرم نعمان منظور۔ سلام مسنون۔ عیدالاضحیٰ کی آمد آمد ہے اس لیے عید مبارک کہہ رہا ہوں۔ اگرچہ سیاسی ابتری اور مسلسل کمر توڑ مہنگائی سے جو صورت حال بن رہی ہے اس میں عید مبارک کہنا بھی بڑے حوصلے کا کام ہے۔

افسوس کہ گذشتہ مہینے جون ۲۰۲۲ کے شمارے سے مَیں محروم رہا، آپ کو میسج بھی کیا اور منتظر بھی رہا لیکن ظاہر ہے پرچہ ایک مخصوص تعداد ہی میں شائع ہوتا ہے اور کوئی اضافی فرمائش پوری نہیں کی جا سکتی۔ بارے اس مرتبہ کا شمارہ ۲ رجولائی کو ہی مل گیا اور سارا پڑھ بھی لیا،

اِس لیے سوچا، خط کے ذریعے اس پر تبصرہ لکھنے کا انتظار دس تاریخ تک کیوں کیا جائے، آج ہی کیوں نہ نمٹا دیا جائے۔ چنانچہ حاضر ہے۔ جولائی کے شمارے میں یہ دیکھ کر ''خوشی'' ہوئی کہ جون کے شمارے میں شائع ہونے والی میری نعت شریف اور غزل پر کسی مراسلہ نگار نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا، بس مجید امجد کا یہ شعر پڑھ کر خود کو تسلی دے لی:

مَیں جب اِدھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے　　مَیں جب اِدھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا؟

سچی بات ہے مراسلہ نگاروں کے اِس رجحان سے میری دل شکنی نہیں ہوتی، مَیں اپنے خطوں میں ہر اچھے شعر کی اور نثری تحریر کی تعریف ضرور کرتا ہوں جس کے جواب میں مجھے کبھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ادلے کا بدلہ بھی ملے۔ بس جو مجھے اچھا لگتا ہے اس کی تعریف کر دیتا ہوں، احباب کو اگر میری تحریریں اچھی نہیں لگتیں اور وہ چُپ رہتے ہیں تو پھر کیسی شکایت!

میں نے کچھ دوستوں سے جون کا نہ ملنے والا شمارہ طلب بھی کیا تھا مگر اتفاق دیکھیے انہیں بھی نہیں ملا تھا، آخر جولائی کا شمارہ پڑھنے سے قبل میں نے کسی طور ویب سائٹ پر مطلوبہ شمارہ کھولنے میں کامیابی حاصل کر لی، مگر مشکل یہ ہے کہ لیپ ٹاپ یا موبائل پر مطالعہ ضعفِ بصری کے سبب مشکل ہوتا ہے۔ ساری تحریروں کا ایک سرسری سا جائزہ لیا البتہ جناب ابدال بیلا کے مضمون ''قدیم یونان'' کی جب جولائی میں دوسری قسط پڑھی تو پھر مجھ پر ویب سائٹ پر اس کی پہلی قسط کی خواندگی لازم ٹھہری کہ اُن کی ہر تحریر کا مَیں دیوانہ ہوں۔ اب اگست میں اس انتہائی دلچسپ اور حسنِ لفظیات سے مرصّع تیسری قسط کا انتظار ہے۔

اب کچھ جولائی کے شمارے کے بارے میں بات ہو جائے۔

برادرم خورشید ربانی کا مضمون ''میر کی متنازع غزل، تحقیق کے تناظر میں'' بڑا اہم لگا اور انہوں نے اپنے تفصیلی مطالعے اور تحقیقی جائزے کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جب تک اس ضمن میں مزید کوئی تحقیقی کام سامنے نہ آئے جو حقائق سے پردہ اٹھا دے، تب تک ہمیں ان اشعار کو مذکور شعرا کے نام ہی سے لکھنا اور پڑھنا ہوگا۔ اب دیکھتے ہیں مزید تحقیقی کام کب اور کون کرتا ہے، اور کیا حتمی نتیجہ نکالتا ہے۔

جناب شاعر علی شاعر نے پروفیسر سحر انصاری کی شاعری کے حوالے سے جو نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے وہ پروفیسر سحر انصاری کے کلیات ''سوادِ سخن'' کا پیش لفظ محسوس ہوتا ہے، جب 'سوادِ سخن' کی زیارت ہوگی تو شاید یہ مضمون بھی قندِ مکرر کے طور پر پڑھنے کو ملے۔ جناب ظفر معین بلے جعفری نے ''معتبر شاعرہ منصورہ احمد کی متنازعہ شخصیت'' کے عنوان سے جو مضمون کی پہلی قسط لکھی ہے اس میں ''متنازعہ شخصیت'' کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہے، غالباً اگلی قسط میں وہ اس پہلو کا احاطہ بھی کریں گے۔ برادرم ناصر نقوی نے ''کھٹے میٹھے بول'' کے عنوان سے جس قدیم مزاحیہ مشاعرے کی تفصیلی رُوداد اور اس میں پیش آنے والی صورت حال کا دلچسپ احوال بیان کیا ہے اس سے یہ مضمون بھی شگفتگی اور زندہ دلی کا عکاس بن گیا ہے۔

اب حمد و نعت کا ایک ایک شعر اور غزلوں کے چند بہت منتخب اشعار لکھ رہا ہوں:

جو ہم ٹوٹی ہوئی تسبیح سا بکھرے تو پھر سے　　بہ فیضِ سلکِ عشقِ مصطفیٰ مالا بنایا　　جلیل عالی

حضور نعت میں کس لفظ کو کہاں باندھوں　　ہمیشہ ہوتی ہے محسوس ہچکچاہٹ سی　　مظہر حسین مظہر

غزلوں کے چیدہ اشعار:

انکھیاں ہم پہ ساتھ ساتھ اٹھیں / شکوۂ بے توجہی نہ رہے
اس سے پہلے کہ شہر بجھ جائے / کاش آنکھوں میں روشنی نہ رہے
بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے / لب رسیلے نہ رہے، نین نشیلے نہ رہے — خالد احمد
اکیلا پن مقدر میں ہے اس کے / مرے دل کو اکائی مل گئی ہے — آصف ثاقب
کیا ہے خون پسینے سے ہم نے جو پیدا / وہ مال جیبوں کے اشراف سے دیا جائے — انور شعور
یہ جو بے وجہ شب و روز چبھن سی کچھ ہے / اس کے اظہار کی اک شکل تجھی سی کچھ ہے — جلیل عالی
سفید برف کی مانند کورے کاغذ پر / مرے قلم نے لکھا ہے، بہت اداسی ہے — جمیل یوسف
آمادۂ زوال ہے یہ شہر اس لیے / اس شہر میں بھی قدرِ ہنر ہو نہیں رہی — باقی احمد پوری
فساد سارے کا سارا یہ بال و پر کا ہے / ابھی فضاؤں میں پرواز کا خطر ہے بہت — خالد علیم
جامِ کوثر پہ تھا ایسا پختہ یقین / ہونے پائی نہ مرہونِ مے زندگی — یعقوب پرواز
ابھی دو وقت کی روٹی نہیں ہوتی ہے پوری / اسی سرائے میں تجھ بھی لے جانے تھے پہلے — خاور اعجاز
شرط بس اک ہے، کہانی ہو تری / کوئی بھی کردار کر سکتا ہوں میں — منظور ثاقب
کوئی تو آئے کا لشکر کو بچانے کے لیے / بزدلوں کی صف میں اک سالار کی امید رکھ — اقبال سروبہ
قتل تجھیں دماغ کا انہیں تو اور کیا ہے پھر / جو امن استوار کرنا چاہتے ہیں جنگ سے — راحت سرحدی
کہا میں نے مرے جیسا بنا دو / کہا اس نے تمہیں گارا کہاں ہے — اوصاف شیخ
ہیں عاشقی میں بھی محفوظ واسطے کے حقوق / یہ شاہرہ ہے مگر تو نے جانی شاہ گزر — حسنین سحر
پہلے کچھ دن مرے لبوں پہ رہی / پھر اداسی کتاب میں رکھ دی — شہزاد نیر
لوگ لڑتے رہیں گے یونہی دوستو / جنگ جاری رہے گی مفادات کی — افضل حسن
کھل جائے گا رستہ بھی نگاہوں بھری چھت کا / پہلے خس و خاشاک تو زینے سے اٹھائیں — طالب انصاری
ہوا کی بات اگر مان بھی لیں فرضِ محال / تو کیا چراغ اندھیرے میں ضم کیا جائے — مسعود احمد
تری گفتار کے چرچے بہت تھے / تری ساری مہارت رہ گئی ہے — طلعت شبیر
چور دروازے سے مسند پہ جو آ بیٹھے ہیں / ان لٹیروں کے تمہیں نام بتا سکتا ہوں — محمد نوید مرزا
وہ سیر ہو کے کبھی خود بھی کھا نہیں سکتا / نظر جو رکھتا ہو ہر ایک کے نوالے پر — شبہ طراز
کچھ پرندوں کے گھونسلے ہیں یہاں / پیڑ پھلدار لگ رہا ہے مجھے — واثق عزیز
ایک دریا نے مجھ کو جلایا / عشق کچا گھڑا بناتا ہے — ارشد محمود ارشد
آواز اٹھانے والے اٹھا ہی لیے گئے / جس نے بھی غائب ان کو کرایا وہ کون تھا — شاہد ماکلی
یہ عنایتیں ہیں ساری، یہ ہے عاشقی کا بدلہ / پڑی عمر بھر تو کھانی، ہمیں درد سر کی گولی — الماس شبی
مکالمہ و مباحث ضروری ہیں جاذب / یہ عقل سہہ نہیں سکتی مگر عتابِ جہل — اکرم جاذب
پھول کاٹے، پھر ان کو پانی دیا / میں نے تیجے پہ باغبانی کی — امجد نذیر
دو دلوں کو ملا دیا اس نے / پھول کی تازگی محبت ہے — رخسانہ سحر
رنج پہچان جاتے ہیں ہر بار / بارہا ننگیں نقاب میں گزری — لیلیٰ مقبول تقیم
ہم تو بس عرضِ ہنر کرتے ہوئے مارے گئے / گونگوں بہروں کی یہاں عمر بڑی ہوتی ہے — علمدار حسین
روز بڑھتی قیمتوں کے / بم گرائے جا رہے ہیں — رانا محمد شاہد
وہ میرے نام کی تشہیر کیوں نہیں کرتا / محبتوں میں رویہ ہے عام سا اس کا — شعیب عدنان
مجھ کو کیا علم، کبوتر مری چھت پر اترے / ایسا موسم ہے کہ چھت پر بھی نہیں جا سکتا — قاسم حیات
ہر اک پہاڑ سے چشمہ ابل نہیں سکتا / بہت کی برف گرے تو یہ درد کھلتا ہے — علی حیدر علوی
دیکھو میں آدمی ہوں پھر زرہ / میری چاہت میں تھوڑا پیار ملا — اعجاز رضوی

آپ جس بات پہ اتراتے ہوئے پھرتے ہیں
ہم فقیروں میں اسے عیب گنا جاتا ہے
عمار یاسر مگسی

کہیں نہ تھا کوئی رستہ سمندروں کی طرف
مگر پہاڑ سے دریا نکالنے سے بنا

صاف پانی گلاس میں بھر کر
آسماں قید کیجیے اس میں
احمد شہریار

میں نے غزلوں کے حصے میں سے بہت چیدہ اشعار لکھے ہیں، بلکہ کچھ کو تو نشان زدہ بھی کیا مگر خود کی طوالت کے ڈر سے شامل نہیں کیا۔ ان بہت سے شعرائے کرام سے معذرت۔

نظموں میں امجد اسلام امجد کی اپنے والد مرحوم کے لیے نظم کے علاوہ تابش کمال کی 'کلُّ مَن علیہا فان'۔ شہزاد نیر کی انگڑائی، سرور حسین نقشبندی کی 'گستاخی' اور وسیم رشید کی "گفتگو گھوڑا" فنی اور موضوعی حوالے سے اچھی لگیں اور کچھ کو تو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا۔ جناب زاہد ہدانی کو میں انگریزی صحافت کے حوالے سے ہی جانتا تھا مگر انھوں نے یار عزیز شاہد ترابی پر نظم لکھ کر حیران کر دیا۔

اس مرتبہ غزلوں کے حصے میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ شاعرات کتابوں میں شامل اپنی شائع شدہ غزلیں بیاض کے لیے بھیج یا بھجوا رہی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ اپنا تازہ کلام عطا کیا کریں۔ یہ رجحان شعرا کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ان محترم شاعرات کی بھی غزلیں فیس بک پر بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ اپنی تازہ شاعری کے خوشگوار جھونکوں سے ہمیں اپنی شعری توقعات سے محظوظ کریں۔

محمد انیس انصاری

معظمی عمران منظور نعمان منظور صاحبان
مدیر و معاون مدیر ماہنامہ بیاض، لاہور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ
امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ سے تین ماہ بعد رابطہ ہو رہا ہے۔ ماہ رمضان المبارک میں حجاز مقدس جانا ہوا۔ میرا قیام ریاض میں اپنے بیٹے کرنل عمر فہد کے ہاں رہا۔ جو پاکستان نیوی سے تین سال کی ڈیپوٹیشن پر سعودی نیوی میں تعینات ہے۔ اس عرصہ میں عمرہ کی سعادت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ آنا جانا بھی رہا اور لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کئی سالوں سے میرا "مناقب" کا ایک پروجیکٹ نامکمل تھا۔ الحمدللہ اس قیام میں یہ پروجیکٹ مکمل ہو گیا۔ پاکستان آ کر اب اس مسودے کی اشاعت کا کام شروع کر رہا ہوں۔ سعودی عرب جاتے ہوئے میں اپنی نعتوں کا مجموعہ "پاسبِ سادات" کے نام سے پبلشر کو دے آیا تھا۔ امید ہے ماہ رواں میں یہ کتاب بھی چھپ کر آ جائے گی۔

حرم پاک اور مسجد نبوی کی حاضری میں حافظ عبداللہ، اعجاز رضوی اور آپ دونوں کے لیے مسلسل دعائیں کرتا رہا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے اور خیر و برکت سے نوازے۔ آمین

واپس آیا ہوں تو "بیاض" کے موجودہ اور پچھلے شمارے ملے۔ کچھ احباب کے آنے جانے اور عید الاضحیٰ کی مصروفیات کے باعث مطالعہ نہیں کر سکا۔ تاہم اب فراغت ہے۔ ان شاء اللہ پڑھوں گا۔ بایں ہمہ "بیاض" کے ٹائٹل نے مجھے سرپرائز دیا ہے۔ جدت اور حسنِ تخلیق نے ٹائٹل کو بہت Attractive بنا دیا ہے۔ ٹائٹل ڈیزائنر کے لیے حروفِ سپاس۔ محبتوں کے ساتھ۔

طالب انصاری

برادر مکرم جناب عمران منظور صاحب
مسنون سلام اور بہت احترام!

"بیاض" کا شمارہ بابت جولائی 2022 گرمی کے شدید موسم میں بہار جاں فزا کا جھونکا لگا۔ جذباتِ امتنان قبول فرمایئے۔ ایدال بھانے یونانی اساطیر کو کہانی کا رنگ دیا۔ زیر مطالعہ پرچے میں ان کا افسانہ نما مضمون اسلوبیاتی سطح پر منفرد ہونے کی وجہ سے بہت دل چسپ لگا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے پتا چلا کہ ملکہ یوروپا کے نام سے پورے براعظم کا نام یورپ پڑا۔ عین ممکن ہے سنسکرت زبان کا لفظ روپا بمعنی چاندی بھی قوموں کے باہمی تعامل سے سنسکرت

میں در آیا ہوں۔ یورپ کی زبانوں اور سنسکرت کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ اسی لیے ہمیں سنسکرت اور انگریزی میں کئی مشترک الفاظ مل جاتے ہیں۔ جیسے ہندی یا سنسکرت میں بیل اور انگریزی میں بُل (Bull) ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ میں نے مزید مشترک الفاظ کا ذکر کیے بغیر صرف بیل کے لفظ کو اس لیے چنا کہ مضمون نگار کے مطابق یونانی کا سب سے بڑا دیوتا زیوس ملکہ یوروپا سے اختلاط کرنے کے لیے بیل کی شکل میں آیا کرتا تھا۔ بیل ہی ہندی اساطیر میں مقدس مانا گیا ہے۔ ہندوؤں کا شیو دیوتا نندی نام کے بیل پر سواری کرتا ہے۔ بہرکیف ابدال بیلا صاحب کا کہانی کا انداز لیے معلومات افزا مضمون بہت پسند آیا۔ یہ لائق مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ سراہے جانے کے قابل ہے۔

خورشید ربانی صاحب نے میر کی ایک غزل پر سیر حاصل معلوماتی مضمون قلم بند کیا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی زمین اتنی مقبول ہو جاتی ہے کہ اس پر اس عہد کے کئی شاعر طبع آزمائی کرنے لگتے ہیں یا طرح مصرع پر بہت سی غزلیں سامنے آتی ہیں۔ اس غزل "آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد" پر بھی کئی شعرا نے غزلیں لکھیں اور اچھے اشعار نکالے۔ کون سا شعر کس شاعر نے کہا تھا، اس کی تحقیق خاصا وقت طلب کام تھا، جسے خورشید ربانی صاحب نے علمی تحقیق کے ساتھ سر انجام دیا۔

تسنیم کوثر صاحبہ کا افسانہ اس المیہ کا عکاس تھا کہ چالاک اور سنگدل لوگ کس طرح معصوم لڑکیوں کے خوابوں سے کھلواڑ کرتے ہیں۔ ناداری میں خوش حالی کے خواب دیکھنے والیاں ہمارے بیمار معاشرے میں سفاک سوداگروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کی نظم سے ماخوذ عنوان "خواب لے لو خواب" کے ساتھ افسانہ نگار نے خوب انصاف کیا۔

شعری گوشے میں بہت سی اچھی غزلیں پڑھنے کو ملیں۔ پسندیدہ اشعار نقل کرنے لگوں تو خط طویل ہو جائے گا۔ شاعر امروز کے ضمن میں شاہد ماکلی صاحب تازہ کار شاعروں کو متعارف کراتے ہیں۔ میں چند اشعار ان تازہ کار اور نوجوان شاعروں کے قلم مکرر کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

خدا کے عرش کا چکر لگانا پڑتا ہے ... مجھے زمیں پہ مصلّیٰ بچھانا پڑتا ہے
کچھ ایسے زخم ہیں جن کا علاج کوئی نہیں ... سو ان پہ میر کا مصرع لگانا پڑتا ہے
عمار یاسر مگسی

پھر یوں ہوا کہ ضبط مرا ٹوٹنے لگا ... پہلے تو رونے والوں پہ حیرت ہوئی مجھے
کوئی پرانی سی تصویر ہے یہ دنیا بھی ... کہیں سے صاف، کہیں سے پھٹی ہوئی ہے
احمد شہریار

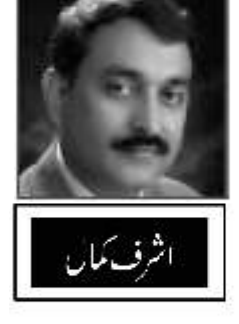

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم

ماہ جولائی کا شمارہ طلوع دیدہ زیب سرورق کے ساتھ اچھا لگا۔
حسب سابق حمد یہ اور نعتیہ کلام سے آغاز کیا گیا۔ خوبصورت غزلوں، نظموں اور مضامین کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔
آغاز میں جناب خالد احمد کے دو قطعات شامل کیے گئے ہیں جو معانی کے نئے در کھولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ "حد" کے عنوان سے دیکھیے:

چوکھٹے بھی وہی دیواریں بھی ... صرف تصویر بدل سکتی ہے
کچھ بدلنے کی نہیں آزادی ... صرف زنجیر بدل سکتی ہے

جلیل عالی کا یہ شعر پسند آیا اللہ تعالیٰ کی اسی تخلیقیت کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسی میں بہتریں تشکیل کی حکمت ہے پنہاں ... کسی کو اس نے جس انداز میں ڈھالا بنایا

عقیل رحمانی کا شعر دیکھیے:

لے کے آئی صبا مدینے سے ... نور کا اک دیا مدینے سے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے مزاحیہ قطعات خوبصورت اضافہ ہیں۔ سرکاری دفتر کا نقشہ خوب کھینچا ہے:

نہ عملہ ہے نہ کرسی ہے نہ peon ہے ... کسی میں کام کرنے کی لگن ہے اور نہ ہمت ہے
نہ کوئی out put ہے اور نہ ہی کوئی decision ہے ... ریویژن ہی ریویژن ہیں revision کی revision ہے

انگریزی اور اردو کو ملا کر خوب نیا اسلوب نکالا گیا ہے۔

''سواد جن کا شاعر'' پروفیسر سحر انصاری کے حوالے سے شاعر علی شاعر کا مضمون خوب ہے۔ اسی طرح شاہد دلاور نے مجید امجد کے حوالے سے عمدہ مضمون لکھا ہے۔

کتاب پہ تبصرہ کے حوالے سے انور ساجد کی خطوط کے حوالے سے کتاب ''کچھ خطوط میرے نام'' شامل کی گئی ہے۔ ان کی شخصیت اپنی جگہ اہم ہے وہ اردو اور انگریزی کے معروف ادیب ہیں۔ انگریزی میں ادب اور تنقید لکھنے والوں میں انھیں شہرت حاصل ہے۔

اعجاز رضوی کا مضمون ہمایوں پرویز شاہد کی ادبی زندگی کو لاہور کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔

غزل کے حوالے سے درج ذیل اشعار پسند آئے:

باقی عجیب درد کا عالم ہے ان دنوں	دل رو رہا ہے آنکھ بھی تر ہو نہیں رہی	باقی احمد پوری
تیری تصویر خواب میں رکھ دی	یعنی خوشبو گلاب میں رکھ دی	شہزاد نیّر
قافلہ بے قطار تھا اپنا	اور میں سوگوار تھا اپنا	فیصل ہاشمی
کچھ پرندوں کے گھونسلے ہیں یہاں	پیڑ پھلدار لگ رہا ہے مجھے	دانش عزیز
سنگِ عشق اب چلے نہ چلے	کاسۂ دل تو بھر گیا ہو گا	سید حسین گیلانی

گلزار بخاری، جلیل عالی، رخشندہ نوید، وسیم جہان، توقیر عباس، خاور اعجاز، رفعت وحید علی آرش، کی غزلیں خوب ہیں۔ سب کی نظمیں اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے اچھی لگیں۔ ماہنامہ بیاض اردو ادب کی جس طرح آبیاری کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب ہاتھوں کو سلامت رکھے، جو اس کی ترتیب و تزئین میں شامل ہیں۔ اور وہ سب احباب یونہی کشتِ ادب کی آبیاری کرتے رہیں۔ آمین

رانا محمد شاہد

محترم مدیران عمران منظور، اعجاز رضوی

السلام علیکم!

''بیاض'' کی سب سے خاص بات اس کا وقت پر موصول ہونا ہے۔ جولائی کا سرورق عید الاضحیٰ کی مناسبت سے دلکش تھا۔ خورشید ربانی کا ''میر کی متنازعہ غزل'' ایک دلچسپ تحقیقی مضمون تھا۔ دیگر میں ہارون الرشید، شاعر علی شاعر، ظفر معین بلے اور شاہد دلاور شاہ کے لکھے مضامین بھی پسند آئے۔ ناصر نقوی ایک مزاحیہ مشاعرے کی دلچسپ روئیداد کے ساتھ حاضر تھے۔ ویسے عید کے موقع پر مختلف چینلز پر مزاحیہ شاعرہ دیکھنے اور سننے کو ملے اور یہ ایک طرح سے ناظرین کے لیے بڑی تفریح ہے۔

ویسے تو خطوط لکھنے، پڑھنے اور سنبھال کے رکھنے کا زمانہ گزر گیا ہے، مگر اس کے باوجود کچھ عشاق آج بھی انھیں سنبھالے ہوئے ہیں اور کتابی صورت میں لا رہے ہیں۔ خرم خرام صدیقی کی ''کچھ خطوط میرے نام'' پر تاثرات دلچسپ رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشاہیر کے خطوط میں دوستانہ اور بے تکلفانہ باتوں کے ساتھ ساتھ ہمارا ادب، تاریخ اور اقدار بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یقیناً ایسے خطوط سنبھال کر کے چھاپنا ادب کی بڑی خدمت ہے۔ رخشندہ نوید اور محمد حفیظ خان کی پیارے بچوں کے لیے بھی ادبی کہانیاں زبردست موضوع تھا۔ ہمارے ہاں بچوں کے ادب کو ادب کا حصہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ بچوں کی تفریح و تربیت کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے ادب اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہو۔

کیا خبر کب وہ حال پوچھ ہی لے	بات کوئی بھی ان کہی نہ رہے	
کاش یہ لفظ اشک جائیں	کاش یہ درد شاعری نہ رہے	خالد احمد
عشق میں جتنا مرا نقصان ہونا تھا، ہوا	مجھ کو آخر بے سر و سامان ہونا تھا، ہوا	
دیر تک دنیا سرائے میں ٹھہرتا کون ہے	مجھ کو بھی کچھ دن یہاں مہمان ہونا تھا، ہوا	نسیم سحر
ذرا سی بات پہ دل سے لگا رہے گا مجھے	خبر نہیں تھی، زمیں پر اچھال دے گا مجھے	
سنے گا بات بڑے انہماک سے میری	پھر اس کے بعد عبورت سے ٹال دے گا مجھے	اکرم ناصر
عشق کرنے کا اختیار ملا	خود سے خود لڑ مرے تو پیار ملا	
اک سمندر ہے بیچ لمحوں کا	اس سمندر سے دور پار ملا	اعجاز رضوی

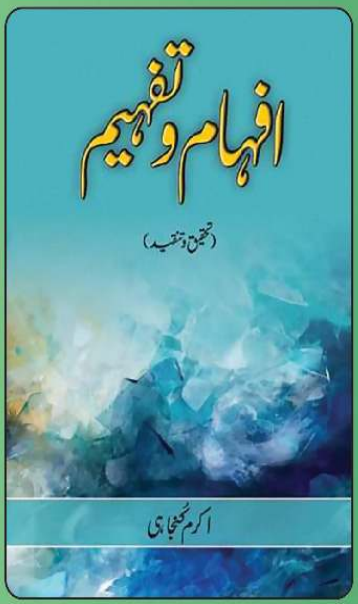
افہام و تفہیم
(تحقیق و تنقید)
اکرم کنجاہی

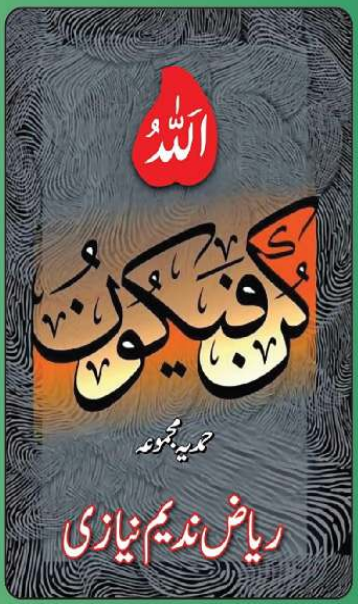
اللہ
کُن فیکون
حمدیہ مجموعہ
ریاض ندیم نیازی

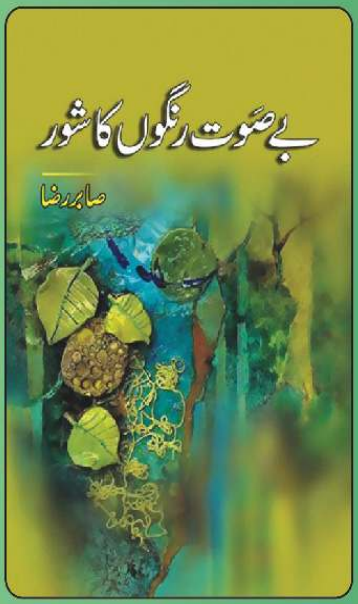
بے صوت رنگوں کا شور
صابر رضا

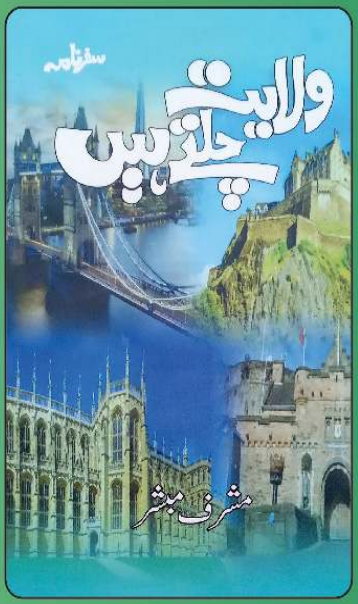
سفرنامہ
ولایت چلتے ہیں
مشرف مبشر

جشنِ
آزادی
مُبارک
75
واں